چائے کے باغ

قرۃ العین حیدر

چائے کے باغ

قرۃ العین حیدر کی دیگر کتب

۱۔ آگ کا دریا
۲۔ کارِ جہاں دراز ہے
۳۔ ہمیں چراغ ہمیں پروانے
۴۔ پت جھڑ کی آواز
۵۔ روشنی کی رفتار
۶۔ جہانِ دیگر
۷۔ گلگشت
۸۔ کوہِ دماوند
۹۔ فصلِ گل آئی یا اجل آئی
۱۰۔ جگنوؤں کی دنیا
۱۱۔ تلاش
۱۲۔ سیتاہرن
۱۳۔ ڈالنگو
۱۴۔ آلپس کے گیت
۱۵۔ آدمی کا مقدر
۱۶۔ ماں کی کھیتی

چائے کے باغ

قرۃ العین حیدر

مکتبہ اردو ادب
بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

ناشر ـــــــــ سرفراز احمد
مطبع ـــــــــ منظور پریس لاہور
قیمت ـــــــــ -/۱۲ روپے

حرفِ آغاز

خونیں جنگوں اور ایٹم بم سے پیدا کئے ہوتے اس تمدن کو وہ بہت دوبھر سمجھتی ہے۔ موجودہ نسل کی "مغربیت زدگی" سے بڑی گھبراتی ہے۔ کاک ٹیل پارٹیوں میں بیٹھ کر وہ سوچتی ہے کہ یہ سب لوگ جو ناچ رہے ہیں، دراصل اپنی حقیقت سے، اپنے مرکز سے، اپنے محور سے کتنے دور نکل گئے ہیں۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ لیکن یہ ماحول، یہ فضا ان باتوں کے لئے موزوں نہیں، اور وہ سوچتی ہے کہ شاید یہ لوگ اب اپنے مرکز سے اتنے دور نکل آتے ہیں کہ ان کی زندگیاں ایک قسم کے کلچرل خلاء میں بسر ہونے لگی ہیں اور اس خلاء کو پُر کرنے کی کوشش میں انہوں نے "جازمیوزک" اور رمبا اور سامبا میں دلچسپی لینی شروع کر دی ہے۔ نئی نئی پیدا کی ہوئی دولت کی نمائش کرنی سیکھ لی ہے ——— لیکن ان کی یہ کوششیں رائیگاں جاتی ہیں اور وہ سب اور بھی زیادہ بے بس اور قابلِ رحم نظر آنے لگتے ہیں اور اپنی زندگیوں کے (TEMPO) میں کچھ اور اضافہ کر دیتے ہیں! ——— اور نہ جانے

اب یہ (TEMPO) کہاں جاکر ٹوٹے گا؟ ——— شاید یہی وجہ ہے کہ پریوں کی کہانیوں کی سنڈریلا کی طرح اینٹی کو بھی یہ احساس ہونے لگا ہے کہ وہ اپنے شیشے کا سلیپر کہیں کھو بیٹھی ہے ——— اور نہ جانے اس کی طرح موجودہ دور کے اور کتنے نوجوانوں، ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور آرٹسٹوں کو ایک شیشے کے سلیپر کی تلاش ہے!

ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ شمشیر نگر کے چھوٹے سے اسٹیشن پر رک گئی۔ میں نے لکھنا ملتوی کر کے اسکرپٹ کے پہلے ڈرافٹ کے کاغذات بیگ میں ٹھونسے اور پلیٹ فارم پر اترا۔ شام ہو رہی تھی۔ اور اندھیرا تیزی سے چھا رہا تھا۔ اسٹیشن سنسان پڑا تھا۔ سب ڈویژنل آفیسر کو ڈھاکے سے تار دینے کے باوجود وہاں کوئی موجود نہ تھا کیونکہ بنگال کے باسی وقت کے متعلق ایک نہایت فلسفیانہ نظریہ رکھتے ہیں۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ایک دیو ہیکل امریکن اور چست پتلون میں ملبوس سنہرے بالوں والی اس کی میم ٹرین سے اتر کر پلیٹ فارم کے پھاٹک کی طرف جا رہے تھے جس سے ذرا فاصلے پر چند جیپ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ قلی نے میرا سامان اٹھایا اور میں نے سوچا کہ اسٹیشن ماسٹر کے دفتر سے ایس۔ڈی۔او کو فون کرنے کی کوشش کروں۔ حالانکہ مجھے مقامی ٹیلی فون سسٹم کا بھی خاصا تجربہ تھا۔

" السلام علیکم "، ایک گرجدار آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا سیاہ شیروانی اور شرعی پاجامے میں ملبوس ایک باریش بزرگ خوش خلقی سے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

شاید یہی سب ڈویژنل آفیسر تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

" آپ ـــــ؟" انہوں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

" جی ـــــ"

" بڑی خوشی ہوئی، بڑی خوشی ہوئی، مجھے اردو ادب سے اب دلچسپی نہیں رہی کہ وہ روز بروز مزید غیر اسلامی ہوتا جارہا ہے۔ مگر میری اہلیہ آپ کے افسانے بڑے شوق سے پڑھتی ہے۔"

" جی ـــــ"، میں نے جھینپ کر انکسار کے ساتھ ہنسنے کی کوشش کی۔ " خاکسار کو بیگ کہتے ہیں۔"

" میں یہاں ٹی ریسرچ پر لگا ہوا ہوں۔ آئیے آئیے میرے ہمراہ تشریف لے چلئے۔ میں ایک عزیز کو لینے آیا تھا۔"

میں نے ان کو بتایا کہ میں یہاں کیوں آئی ہوں اور کہاں جانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ ان کے عزیز (وہ بھی باریش تھے) سامان اٹھوا کر نزدیک آئے۔ جیپ میں اسباب رکھا گیا اور اونچے نیچے راستے پر ہچکولے کھاتے ہم لوگ سری منگل کی سمت روانہ ہوئے۔ امریکن کی جیپ دھول اڑاتی آگے آگے جا رہی

تھی۔ دھول سے بچنے کے لئے میں سلو لائیڈ کے پردے سے سٹ کر بیٹھ گئی
اِدھر اُدھر کی چند باتیں کرنے کے بعد گاڑی چلاتے چلاتے انہوں نے دفعتاً
مڑ کر مجھے مخاطب کیا "عزیزہ ــــ اسلامی ناول لکھیئے۔ ملت کی کشتی" گیئر بدلتے
ہوئے انہوں نے کہا۔

" ڈانواں ڈول ہے۔"

" جی ــــ"

" معاف کیجئے گا۔ ڈاک بنگلہ جنگل کے عین وسط میں ہے اور آج بالکل
خالی پڑا ہے۔"

" کوئی بات نہیں ــــ" میں نے رسان سے جواب دیا۔ "میں مشرقی پاکستان
کے دور افتادہ ڈاک بنگلوں میں رہنے کی عادی ہوں" باریش بزرگ (وہ
بزرگ قطعی نہیں تھے بینتالیس اڑتالیس سال کے رہے ہوں گے۔ مگر ایک
نہایت رُعب دار سیاہ داڑھی اور بھاری بھرکم جُثے نے شانِ بزرگی عطا کر
رکھی تھی۔ میرے متعلق بہت خلوص سے ساتھ فکر مند نظر آ رہے تھے۔ میرے
اس طرح تن تنہا اور بے پردہ جنگل جنگل گھومنے سے ان کو کتنا دُکھ ہوا ہوگا
میں نے سوچا اور فوراً سر ڈھانپ کر بیٹھ گئی۔

" آپ کلمہ جانتی ہیں۔" انہوں نے اچانک سوال کیا۔

" جی ــــ"

"پانچوں کلمے۔"

"جی۔"

"تعلیماتِ قرآنی پر عمل پیرا ہیں۔۔۔؟" پھر اسی اچانک پن سے وہ اپنے رشتے دار کی طرف مڑے "میں کہتا ہوں۔ نوجوانو۔۔۔ اسلام کی خاطر الجن بن جاؤ۔ الجن بن جاؤ۔" لفظ "الجن" انہوں نے تقریباً گرج کر ادا کیا۔ رشتے دار نے سر ہلایا۔

جیپ ڈاک بنگلے کے احاطے میں داخل ہوتی۔ "رات کا کھانا غریب خانے پر تناول فرمایئے۔ میں اور میری اہلیہ گھنٹے بھر میں آن کر آپ کو لے جائیں گے۔" باریش بزرگ نے مجھ سے کہا۔

چوکیدار لپکا ہوا آیا۔

"کمو نور العباد۔ کیسے ہو۔۔۔" میں نے خوش ہو کر اس سے پوچھا۔۔۔

کچری داڑھی اور نیلی تہمد والے نور العباد کی باچھیں کھل گئیں۔ باریش بزرگ نے خدا حافظ کہا اور جیپ زنّاٹے سے باہر نکل گئی۔ نور العباد نے ایک کمرہ کھول کر لالٹین میز پر رکھ دی۔

"تم کو یاد ہے نور العباد۔۔۔ ہم چار سال ہوئے یہاں آئے تھے۔"

"خوب یاد ہے۔ مس صاحب۔ آپ لوگ ادھر مانی پوری ناچ کی فلچر بنانے آیا تھا۔ شوٹنگ کرتا تھا۔"

"تمہارے بیوی بچے راضی خوشی ہیں نورالعباد۔"

"اب چار ٹھولے لڑکا اور ہو گیا ہے ۔مس صاحب۔"

"اب کتنے بچے ہیں تمہارے ۔۔؟"

"اب سب ملا کر نو ٹھو لڑکا ہے ۔مس صاحب۔" اُس نے خوشی سے جواب دیا۔" ہم چاء لاتا ہوں۔"

مانوس کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لوہے کا پلنگ بھدی، مدھم آئینے والی سنگھار میز، خاکی جھمر دانی غسل خانے کی بالٹی اور ٹب میں تازہ پانی بھرا تھا ـــــ اور نام چینی کا جگ اور چلمچی کھُردری سفید میز پر سلیقے سے دھری تھی۔ کھڑکیوں سے نیچے اونچی اونچی گھاس لہرا رہی تھی۔ دور باورچی خانے میں لالٹین ٹمٹماتی تھی۔ سیڑھیاں اُتر کر میں تانگہ کے پیشے کی طرف گئی۔ نورالعباد کی سانولی سلونی بیوی بغیر بلاؤز کے اُودی ساری لپیٹے دیوار سے لگی کھڑی تھی ـــــ اور اس کی بوڑھی ساس فرش پر بیٹھی نواں پوتا کھلا رہی تھی۔ میں اُن دونوں سے ٹوٹی پھوٹی بنگالی میں باتیں کرتی رہی۔ نورالعباد نے باورچی خانے کے دروازے میں سے جھانک کر آواز دی "مس صاحب چاء تیار ہے۔" میں نے کمرے میں آکر چاء پی اور لالٹین کی روشنی میں بالوں میں سے دھول جھاڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ باہر بلارن بنگلا بارش بزرگ اور ان کی اہلیہ آچکے تھے۔

ٹی ریسرچ اسٹیشن کے سیمنٹ کے نئے وضع کے چھوٹے چھوٹے بنگلوں میں سے ایک کے سامنے باریش بزرگ نے کار روک لی (اسوقت وہ اپنی سیاہ رنگ کی اسٹوڈی بیکر میں آتے تھے) برآمدے میں داخل ہو کر لیٹر بکس پر لکھے ہوئے ان کے پورے نام پر نظر پڑی۔ایم۔ایس۔اے بیگ اس کے ساتھ سائنس کی متعدد ڈگریاں وابستہ تھیں۔ان کی اہلیہ مشرقی یوپی کی ایک شرمیلی، کم عمر گھریلو لڑکی تھی جس نے کاسنی چھینٹ کے غرارے اور ڈوریے کی چھپتی قمیض پر ٹل کا چنا ہوا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔اس کا نام کلثوم تھا۔ ڈرائنگ روم میں بہت سے مہمان جمع تھے۔جنہوں نے باریش بزرگ کو دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔

"آہاہا۔ مرزا صاحب آگئے ــــ" مہمانوں میں دو نرک بھی شامل تھے۔ جو چائے کی کاشت کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لیے انقرہ سے آئے

تھے۔ کھانے سے پہلے میں نے اپنی کزن زرینہ کو ہری نگہ ٹی اسٹیٹ فون کرنا چاہا۔ مگر فون خراب ہو چکا تھا۔

"چلیئے ہم لوگ کلب چلتے ہیں۔ وہاں فلم شو ہے۔ اس لئے یقیناً آپ کی ہمشیرہ بھی آئیں گی۔" بارلیش بزرگ نے کہا۔

"کلب کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"زیادہ دور نہیں ـــ کوئی پچیس میل ہوگا۔"

"پچیس میل ـــ؟" نووارد رشتے دار نے دہرایا۔

"چار بگان کے فاصلے اسی نوع کے ہیں برادر۔ سہلٹ میں ایک سو بیس باغات ہیں اور جب ہم لوگ دوستوں سے ملنے کی غرض سے نکلتے ہیں تو سو پچاس میل کا پالا مار کر آتے ہیں۔ آپ کے برادر نسبتی کی ٹی اسٹیٹ،" بارلیش بزرگ نے اب مجھے مخاطب کیا۔ "یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے ـــ"

کھانے کے بعد موٹریں اور جیپ گاڑیاں کلب روانہ ہوئیں۔ بارلیش بزرگ کی اہلیہ نے بچے کو سلا کر جلدی سے سیاہ بُرقعہ اوڑھا اور کار کی پچھلی سیٹ پر میرے پاس آن بیٹھی۔ "میں پکچر دیکھنے کے لئے کبھی کبھار ہی کلب جاتی ہوں۔ ان کو یہاں کی سوشل زندگی پسند نہیں۔"

"خدا کرے زرینہ کلب میں مل جائے۔ ورنہ بڑی کوفت ہوگی۔" میں

نے کہا۔ "میں تو ارسلان بھائی کو پہچانتی بھی نہیں ہے۔"

"آپ اپنے برادرِ نسبتی سے آج تک نہیں ملیں ــــ؟" بارینش بزرگ نے پوچھا۔

"جی نہیں۔"

"آپ کے برادرِ نسبتی کلکتے کے بنگالی ہونے کے ناطے معقول اُردو بولتے ہیں اور بہت صالح مسلمان ہیں ــــ" بارینش بزرگ نے مجھے مطلع کیا اور کار چلانے میں مصروف رہے۔

کلب کے احاطہ میں ان گنت موٹریں کھڑی تھیں۔ ہفتہ وار فلم شو کی وجہ سے دور دور کے باغات سے لوگ آئے تھے۔ قدیم برطانوی عہد میں بنی ہوئی عمارت کے اندر چائے کے "اعلیٰ سوسائٹی" جگمگا رہی تھی۔ ہیکاٹنشن ٹی پلانٹرز قریبی اضلاع کے نئے کارخانوں کے چند امریکن اور جرمن فلیچو گنج کے نئے کھاد کے کارخانے کے جاپانی انجینیئر اور ان کی خواتین، چائے کے باغات کے نوجوان پاکستانی عہدیدار اور ان کی الٹرا ماڈرن بیگمات۔ باغات میں عموماً ملک کے اونچے طبقے کے نوجوان کام کرتے تھے کیونکہ یہ ایک بے حد فیشن ایبل اور انتہائی "ہائی کلاس" ملازمت تھی۔ یہ سب زیادہ تر مغربی پاکستان سے آئے تھے۔

میں کلثوم کے ساتھ چہرے سے ایک دبیز صوفے پر بیٹھ گئی۔ ہال کی روشنیاں

بجھیں اور ایک معمولی سا امریکن فلم شروع ہوا جو میں پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔
سینکڑوں کا مجمع فلم دیکھنے میں محو ہو گیا۔

باہر گھُپ اندھیرے میں سینکڑوں میل تک چار بگان، جنگل اور گاؤں
پھیلے ہوئے تھے۔ پیچ دار راستے، ندیاں اور ابدی سناٹا۔ نازنگی کی ڈالیوں
کی موسیقی ریز سرسراہٹ۔ تاریکی اور وسعت اور تنہائی کے اس بھنور میں
برطانوی انداز کے اس کلب کے اندر بہ تین چار سو افراد، مخملیں۔ دبیز
جہازی صوفوں میں دھنسے ڈورس ڈے کا تماشہ دیکھنے میں منہمک تھے۔
ان کا اس دھرتی سے کوئی رشتہ نہ تھا سوائے روپے کے کوئی ہمدردی نہ تھی
کوئی تعلق نہ تھا اور انہی افراد کی طرح کے لوگ صرف چند میل دور، سرحد کے
اُس پار، اسی معطر دھرتی، اسی زرخیز مٹی پر، اُسی سریلے اندھیرے میں آسام
کے چار بگان میں اسی طرح برطانوی وضع کے کلبوں میں بیٹھے اسی قسم کی
فلم دیکھنے میں مصروف ہوں گے۔ یہی لب و لہجہ، یہی ذہنیتیں، یہی تراش
خراش اور وضع قطع۔ یہی اندازِ گفتگو۔ یہی دلچسپیاں۔ وہاں بھی دیسی عہدیداروں
کی بیویاں اس قسم کی ساڑیاں پہنے اسی تازہ ترین وضع کے بال سنوارے
ایسی ہی سطحی گفتگو میں مشغول ہوں گی۔ ان سب لوگوں کا اس قدیم دکھی
زخمی دھرتی سے کیا سمبندھ تھا ــــــ؟ زمین کا رشتہ انسان سے کس طرح
بندھتا ہے ــــ؟ کس طرح ٹوٹتا ہے؟ کس طرح استوار کیا جاتا ہے ــــ؟

روشنیاں جلیں۔ کلثوم نے فوراً منہ پر سیاہ جارجٹ کی نقاب گرالی۔ ہم نے کھڑے ہو کر زرینہ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں اور کلثوم بانو کے ساتھ ہال کے سرے پر آ گئے۔

اتنے میں پیچھے سے کسی نے میرا نام لے کر خوشی کا نعرہ بلند کیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔

میری پھوپھی زاد بہن زرینہ سبز ساڑھی پہنے، کندن کے زیوروں میں جگ مگ کرتی، دلہن بنی کھڑی تھی۔ ہم دونوں دوڑ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور خوشی کے مارے دل چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روئیں۔

اس اثنا میں کلثوم مجمع میں کھو چکی تھی۔ میں اور زرینہ باتیں کرنے کے لئے جلدی سے پاوڈر روم میں گھس گئے۔ جہاں چند غیر ملکی خواتین اپنی اپنی ناکوں پر پاوڈر لگا رہی تھیں۔ ہم دونوں کو بے طرح شور مچاتے دیکھ کر ایک اسکاٹش بڑھیا نے مسکرا کر آنکھیں چندھائیں۔

"معنز یک ڈانلڈ ——" زرینہ نے جلدی جلدی کہا۔

"یہ میری کزن ہے۔ ہم تقسیم کے بعد آج ملے ہیں۔" پھر اس نے پاوڈر روم میں داخل ہونے والی مزید شناسا خواتین سے میرا تعارف کرانا شروع کیا۔

"زرینہ میں ذرا باہر جا کر اپنے میز بانوں کا شکریہ تو ——"

" مسز عثمانی ـــ یہ میری کزن ـــ کیونکہ میں تو صرف تین سال ہوئے لکھنؤ سے شادی کرکے ـــ شادی ہوکے ـــ یہاں آئی ہوں ـــ اس لئے اب تک ـــ" اس نے ہڑبڑا کر پھر داستان شروع کی۔

" زرینہ میرے میزبان ـــ"

میں جلدی سے باہر نکلی اور ہال میں کلثوم سے ٹکرا گئی۔

" آپ کے دولہا بھائی ارسلان احمد صاحب آپ کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں ۔" اس نے کہا۔ اتنے میں بارٹیش بزرگ بھی ہجوم میں سے نمودار ہوئے۔ میں نے ان دونوں کا دلی شکریہ ادا کیا اور وہ میاں بیوی ہال کے بڑے دروازے سے نکل کر کار پارک کی طرف چلے گئے۔

اب بیگمات اور خواتین کے انبوہ کلب کے کینٹین اسٹور کا رُخ کر رہے تھے۔ " چلو مجھے بھی تھوڑا سا سامان خریدنا ہے۔" زرینہ نے میرے قریب آکر کہا اور اپنے شوہر سے ملوایا۔ " یہ تمہارے ارسلان بھائی ہیں۔ دیکھو سٹے اسٹور کے ایک کاؤنٹر کے پاس وہ سنہرے بالوں والی میم کھڑی تھی۔ جسے میں نے شام ریلوے اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ بہت سے حضرات اس کے گرد جمع تھے۔ جن سے وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ ظاہر تھا کہ اس کی گلیمرس شخصیت نے وہاں کافی تہلکہ مچا دیا تھا۔

" یہ عورت امریکن ہرگز نہیں ہے۔ ہندوستانی ـــ میرا مطلب ہے"

پاکستانی ہے۔ سٹے لگالو۔" دور سے اسے دیکھ کر زرینہ نے میرے کان میں کہا ـــــ

"تم جانتی ہو اسے ـــــ؟"

"نہ صرف میں جانتی ہوں بلکہ شاید تم بھی واقف ہو۔" اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے ایک نظر غور سے دیکھنے کے بعد میری کزن نے جواب دیا۔

ارسلان بھائی نے قریب آکر کہا "زرینہ مسٹر اور مسز فریزر بھی ہمارے ساتھ چل رہے ہیں۔ ان کی جیپ خراب ہو گئی ہے۔ یہ لوگ کرنل مورگن کے یہاں ٹھہرے ہیں۔" ارسلان بھائی اسٹور سے باہر چلے گئے۔ زرینہ امریکن خاتون کے پاس مارچ کرتی ہوئی پہنچی اور بڑی معصومیت سے پلکیں جھپکا کر اردو میں پوچھا۔

"معاف کیجئے گا ـــــ آپ راحت کاشانی ہیں نا ـــــ؟"

میم نے چونک کر اسے دیکھا، چند لحظوں تک دیکھتی رہی اور یہ ظاہر کیا کہ وہ اردو نہیں جانتی۔

"اوہ ـــــ کم آن راحت ـــــ" زرینہ نے ڈھٹائی سے کہا۔

"میرا نام ـــــ" میم نے بڑے وقار سے ایسی انگریزی میں جس میں امریکن لہجے کا برائے نام شائبہ تھا ـــــ جواب دیا ـــــ مسز چارلس فریزر ہے ـــــ

ریٹا فریزر۔“

دوسرے لمحے چارلس فریزر نے اسے آواز دی۔ اور وہ باہر چلی گئی۔

” اور تو اور ۔۔۔ یہ نام بھی بوگس ہے۔ شرط لگا لو۔“ زرینہ نے کہا۔

ارسلان بھائی کار کا دروازہ کھولے ہمارے منتظر تھے مسٹر اور مسز فریزر ان کے ساتھ سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کار کلب سے نکل کر ٹی اسٹیٹ کی سمت روانہ ہوئی۔ ارسلان بھائی اور مسز فریزر باتوں میں منہمک تھے۔

کچھ دیر بعد زرینہ نے شرلک ہومز کے سے خطرناک اور پُر اسرار انداز میں ہونٹ لٹکا کر اور آگے جھک کے ذرا آہستہ سے کہا۔” مگر کمال ہے۔ واقعی راحت تم سے بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی۔ اور کیا عجیب حُسنِ اتفاق ہے۔“

میم نے مطلق جواب نہ دیا۔ گو اب اس کا بشاش بے تکلفی کا لہجہ غائب ہو چکا تھا جس میں وہ اب تک ارسلان بھائی سے نیا دلہ خیالات کر رہی تھی ”ہم لوگ کینیڈا واپس جائیں گے۔ تو آپ کا یہ حسین ملک بہت یاد آئے گا۔ حالانکہ یہ میرے وطن امریکہ سے کس قدر مختلف ہے۔“

” یہ بھی جھوٹ ہے۔ یہ امریکہ آج تک نہیں گئی۔“ زرینہ نے بہت آہستہ سے مجھے گوش گزار کیا۔” مگر قسم خدا کی۔ واہ۔ کیا قابلِ تعریف

خود اعتمادی ہے۔ جواب نہیں۔"

ہم لوگ پَو پھٹتے منزلِ مقصود پر پہنچے۔ وادی کے نشیب میں کرنل مورگن کے بنگلے پر امریکیوں کو اتار کر گھر کا رُخ کیا۔

زرینہ کا بے حد خوبصورت اور شاندار بنگلہ چائے کے باغات میں گھری ایک نیچی سی پہاڑی پر ایستادہ تھا۔ اس کا ماحول خالص انگریزی تھا۔ کیونکہ ارسلان بھائی سے قبل اس ٹی اسٹیٹ کے منیجر ہمیشہ انگریز ہوتے تھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور ڈرائنگ روم کے سرخ اینٹوں والے گھرے آتشدان میں آگ لہک رہی تھی۔ مختلف اقسام کے کتے اِدھر اُدھر محوِ خواب تھے جگمگاتے سرخ روغنی فرشوں والے جھل جھل کرتے کمروں میں پھولوں کی افراط تھی غسل خانوں کے چینی کے ٹبوں کے نیلے پانی پر ربر کی بطخیں تیر رہی تھیں۔ مسہریوں پر اصل لیس کے پلنگ پوش بچھے تھے۔

صبح کو بیرے نے برآمدے کے پھولوں سے گھرے کنج میں بریکفاسٹ سرو کیا۔ دوپہر کے کھانے، شام کی چائے اور رات کے کھانے کے وقت میز کی چادر، نپکین، برتن اور اسٹرلنگ سلور کے چھری کانٹے ہر مرتبہ

مختلف تھے۔ اب میں یہ توقع کر رہی تھی کہ ارسلان بھائی ڈنر سے پہلے ڈنر جیکٹ پہنیں گے۔ زرینہ صبح کو برآمدے میں بیٹھ کر خواتین کے ساتھ ماہ جونگ کھیلتی تھی یا دوسری خواتین کے گھروں پر جا کر ماہ جونگ کی محفل منعقد کرتی تھی۔

"یا اللہ ــــ زرینہ ــــ" میں نے ہڑبڑا کر کہا۔

"کیوں ــــ کیا ہوا۔" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"حد ہو گئی۔"

"مت بھولو کہ تمہارے لڑکپن تک تمہارے گھر کا بھی تقریباً اسی قسم کا ماحول تھا۔"

"ہاں۔ مگر اب زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔"

"کوئی نہیں بدلا وِدلا۔"

"تم کام کیوں نہیں کرتیں۔؟"

"کیسا کام۔؟"

"ارے اپنی ڈاکٹری اور کیا۔"

"یار۔" اس نے خانساماں کو لنچ کا آرڈر دیتے ہوئے کہا۔

"اب کیا ساری عمر فرض ہے کہ کولہو میں جُتے رہیں۔ نا بھائی صاحب ہم بہت دنوں کام وام نہیں کریں گے۔ ہم تو بس ماہ جونگ کھیلیں گے۔

اور کلب کے چیرٹی بازار آرگنائز کریں گے۔ ویسے اب میں ایک صحافی خاتون بن گئی ہوں۔“ اُس نے ذرا سُشرا کر انکسار کے ساتھ اضافہ کیا۔

” واقعی ـــ یہ تو بہت عمدہ بات ہے۔“ میں نے خوش ہو کر دریافت کیا۔ ”مارننگ نیوز ـــ ؟ پاکستان ٹائمز ـــ ؟“

” نہیں۔ میں کراچی کے سوسائٹی ماہنامے ”آئینہ“ کے لئے سلمٹ ٹی گارڈن کا خبر نامہ لکھتی ہوں کہ فلاں بیگم فلاں ڈنر میں نارنجی ساری پہنے بے حد چارمنگ لگ رہی تھیں۔ یو نو ـــ وہیٹ سورٹ آف تھنگ۔“

” آہا ـــ“

وہ کھوکھلی ہنسی ہنسی اور منہ لٹکا کر بیٹھ گئی۔ ”آل فاؤنڈ۔ زندگی آل فاؤنڈ ہونی چاہیئے۔ جیسی میری زندگی ہے۔“ پھر اس نے یک لخت بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”میں ایک PARASITE خاتون ہوں۔“

” آپ ایک بوگس خاتون ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

یہ اتوار کا شگفتہ سہانا دن تھا۔ ہم بریک فاسٹ کے بعد سامنے کے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ میں نے ارسلان بھائی سے کہا تھا کہ میں ڈاکومنٹری کی تیاری کے سلسلے میں مزدوروں کے حالات جاننا چاہتی ہوں اور اب ایک نمائندہ گروہ کا انتظار کر رہی تھی۔

” اب تم شروع کرو اپنا انٹرویو۔“ زرینہ نے بڑے اشتیاق سے کہا۔ ”مزدوروں

سے کھیلنے سیڑھیوں پہ پہنچ کر ڈنڈوت اور پالاگن کیا۔ اس کے ساتھی زمین بوس ہوگئے۔ زرینہ نے متانت سے سر ذرا سا خم کرکے ان کی بندگی کا جواب دیا۔ میں ہکا بکا اسے دیکھا کی۔ میری کزن زرینہ جو لکھنؤ میڈیکل کالج کے لفٹ ونگ گروپ کی جوشیلی لیڈر رہ چکی تھی۔

مزدور مرد اور عورتیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ ذرا خائف سے نظر آرہے تھے۔ ارسلان بھائی ڈریسنگ گاؤن پہنے اندر سے نمودار ہوئے اور بید کی کرسی کھینچ کر ان کے مقابل میں فروکش ہوگئے۔

"آہا ہا۔" میں نے ان کو چڑایا۔ "بالکل ایسا لگ رہا ہے۔ جیسے ۱۹۳۲ء میں ضلع غازی پور کا انگریز کلکٹر اپنے دربار میں بیٹھا ہو۔"

"احمق ـــ" انہوں نے نیک دلی سے مسکرا کر کہا۔ "اب پوچھو ان لوگوں سے کیا پوچھنا ہے۔"

"تم لوگ ـــ بارہ بنکی سے آتے ہوتے ہو۔" میں نے پوچھا۔

"سیتاپور سے بیگم صاحب۔" کھیا اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے تعجب اور پریشانی ہویدا تھی۔

"گھبراؤ نہیں رام نندن۔ تمہاری لکھا پڑھی نہیں ہوگی۔ یہ بٹیا بڑی دور کراچی سے آتی ہیں۔ تم لوگوں کا سینما بنانے۔" ارسلان بھائی نے کہا۔

"بیلما۔" ایک نوجوان نے خوش ہو کر کہا۔

" پھولو کھینچے ـ " عورتوں نے آپس میں سرگوشی کی۔

" تو کب آئے تم لوگ یہاں ـ " میں نے سوال کیا۔

" بہوت جانا ہوا ـ "

" اتنی دور سلنٹ کیسے آئے ـــ ؟ "

" امی کی کھا تم بٹیا ـ " بوڑھے کمھیا رام نندن نے اپنا پچکا ہوا پیٹ بجایا

" صاحب لوگ کاشتی اور کلکتے جاتا تھا۔ خود بھرتی کرنے اس نے جنگل ما بندوبست کیا۔ وکھل کیا۔ پھر سردار لوگ۔ "

" سردار لوگ مزدوروں کے ہیڈ مین تھے۔ گر گئے " ارسلان بھائی نے کمھیا کی بات کاٹ کر مجھ سے وضاحت کی۔

" سو سال قبل انگریزوں نے مشرقی یو۔ پی کے بھوکے ننگے کسانوں کو اپنے گرگوں کے ذریعہ یہاں بلوایا تھا۔ چائے باغان میں کام کرنے کے لئے۔ یہ گرگے یا سردار انگریزوں کا دیا ہوا روپیہ خود رکھ لیتے تھے اور مزدوروں کو صرف دو وقت کی روٹی دیتے تھے۔ "

ارسلان بھائی کی بات سن کر کمھیا نے سر ہلایا اور کہنا شروع کیا " سردار لوگ ہمرے باپ دادا کو اور ہم کو روٹی کپڑے کا لالچ دے کر ادھر لے آیا۔ او جانے بیں ریل کا راستہ نہ رہی۔ ہمرے باپ دادا ماٹی کاٹے رہن "

" ماٹی کاٹے رہن ـــ ؟ " میں نے دہرایا۔

" ارے دادا پہلے باگ میں کام کریں پھر جاکر ماٹی کاٹیں۔ ربل بچھاتے کھانسہ۔" ایک بوڑھی عورت نے جواب دیا۔

" رام نندن بیٹا کو سب کے نام بتاؤ پہلے۔" ارسلان بھائی نے کہا۔

" ہم رام نندن ـــــ ای ہمری بہن گلیجر با۔ ای ترلوچن۔ ای سکھ نندن ای رام کمرن۔ ای بس میتا۔ ای پاربتی۔" سب نے سر ہلائے۔ پاربتی ایک اٹھارہ سالہ سانولی سلونی لڑکی تھی اور بڑی طرح لجا رہی تھی۔

" اسے تم اپنی فلم میں ضرور لو۔ بہت اچھا ناچتی ہے۔" زرینہ نے مجھ سے کہا۔ بلکہ اپنا مرکزی کردار اسی کو بناؤ۔ بہت فوٹوجینیک ہے۔"

" اور تم یہاں کون کون تہوار مناتے ہو ـــ؟" میں نے مکھیا سے دریافت کیا ـــ

" ارے اب رام لیلا نہیں ہوتا بیٹا ـــ رام نومی۔ کھچڑی۔ ہولی دیوالی کچھ نہیں ہوتا۔"

" کیوں ـــ؟"

وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے ارسلان بھائی کی طرف دیکھا۔ انہوں نے انگریزی میں کہا " پھر بتاؤں گا۔"

پھر فلم میں مزدوروں کے بشاش تہوار کیسے دکھائے جائیں۔ خیر کچھ نہ کچھ اسٹیج کر لیا جائے گا۔ میں نے سوچا۔

"اور تم ترلوچن —؟" میں نے ایک اور مزدور سے پوچھا۔

"ہم بیٹا دس سال کی عمر میں اعظم گڑھ سے آئے رہن ضلع اعظم گڑھ۔ تھانہ چریا کوٹ، بڑا باپ، مہاجن سے پچاس ساٹھ روپیہ کرجہ لیا۔ مہاجن روپے میں چھ آنے سو وبیت رہا۔ بڑا باپ اُدا ادا نہیں کر سکا تو مجوروں میں بھرتی ہو کر یہاں آ گیا۔ دس برس میں پچاس روپیہ جوڑ کر پھر دیس واپس گیا۔"

"کب کی بات ہے —؟" "جب فورڈ گاڑی نہیں چلی تھی۔"

"اور تم کلکتہ رہیا —؟"

"ہم برٹش کے راج میں مرجا پور سے کلکتے آئے رہے۔ وہاں سے گوالندو گھاٹ آئیں۔ پھر ہم آ آدمی مار کھا گیا۔"

"پاکستان کب بنا تھا یاد ہے —؟"

"پاکستان بنے تو ڈھیر دن ہو گیا بیٹا۔"

"بیٹا —" مکھیا نے ذرا اشر ماکر کہا۔ "ایک بات بتاتے۔ آپ — ہم لوگن کی بولی کیسے بول لیتی ہیں —؟"

"ایسے ہی رام نندن —" دفعتاً میں نے سوچا کہ اسکرپٹ کے لئے یہ انٹرویو بالکل بے کار ہیں۔

مجھے خیال آیا کہ اُنیسویں صدی کے شروع میں لارڈ کارنوالس کے استمراری

بندوبست کے بعد مشرقی یو۔پی کے ہزاروں فاقہ کش کھیت مزدوروں کو جہازوں میں بھر بھر کے الیسٹ انڈیز، فی جی، مارشیس اور دوسرے ملکوں کو بھیج دیا گیا تھا جہاں وہ برطانوی پلانٹیشنز پر غلاموں کی طرح کام کرتے تھے اور آج تک اُن کی اولاد وہاں تقریباً اسی حالت میں موجود ہے۔

کچھ دیر بعد مزدور واپس چلے گئے۔ اسی وقت ایک سیاہ فورڈ کونسل آن کر رُکی۔ جسے ایک کھنتی بالوں اور نیلی آنکھوں والی خوش شکل لڑکی ڈرائیو کر رہی تھی۔ اس کے پہلو میں ایک سفید بالوں والی انگریز ضعیفہ بیٹھی تھیں۔ اور تین بچے، دو لڑکیاں اور ایک لڑکا پچھلی سیٹ پر آپا کے ساتھ براجمان تھے۔ زرینہ ڈرائیو پر جاکے اس لڑکی سے باتیں کرنے لگی اور حسبِ معمول میری آمد کے واقعے پر روشنی ڈالی "یہ صنوبر ہے" زرینہ نے مجھ سے کہا "اور مسز ظفر علی، صنوبر کی ممی،" ضعیفہ شفقت سے مسکرائیں۔

"ابا کا خط آیا ہے۔ وہ لوگ سبھا کے لئے کانگریس ٹکٹ پر کھڑے ہو رہے ہیں ــ" صنوبر نے زرینہ سے کہا۔ انگریز نژاد ہونے کے باوجود اس کا اردو لب و لہجہ حیرت انگیز حد تک لکھنوی تھا۔

اتنے میں ایک اور کار اندر داخل ہوئی۔ چونکہ اتوار کی صبح تھی۔ لوگ باگ ایک سرے سے پنڈال کو تنے یا باہر کرنے کے لئے نکلے تھے۔ یا اللہ کس قدر ELEGANT دکھوں سے بے نیاز زندگی ہے۔ میں نے سوچا۔ نو وارد ایک

اسکاٹش جوڑا تھا۔ انہوں نے زرینہ سے کہا کہ کرنل مورگن نے مسٹر اور مسز فریزر کے اعزاز میں رات کے ڈنر پہ ہم سب کو مدعو کیا ہے۔ فریزر کل صبح چند روز کے لئے چنڈی چھیرہ ٹی اسٹیٹ، چاند پور، ایگان چلے جائیں گے۔

"جاؤ گی ۔۔۔ ؟" زرینہ نے صنوبر سے پوچھا۔

"نہیں ۔۔۔" اُس نے مختصراً جواب دیا اور خدا حافظ کہہ کر کار اسٹارٹ کر دی۔

"اور تم اور ارسلان ۔۔۔ ؟" مسٹر میلکم میک فرسن نے زرینہ سے دریافت کیا۔

"میری کزن ۔۔۔" زرینہ نے حسبِ معمول وضاحت کی۔

"ہم لوگ مدتوں بعد ملے ہیں" تین چار دن تک متواتر باتیں کریں گے ۔ اس لئے فرصت نہ ہوگی۔"

مسٹر و مسز میلکم میک فرسن کے جانے کے بعد میں نے صدر دفتر تار بھجوایا۔ "ٹی گارڈن ورکرز مائی نورٹی کمیونٹی کلچر میں اسلامی ماحول کس طرح دکھایا جائے فوراً مطلع کیجئے۔"

اس کے بعد میں تار کے جواب اور ڈھاکہ سے کیمرہ مین کی آمد کے انتظار میں اطمینان سے گپیں ہانکنے کے لئے بیٹھ گئی۔

رات کو کھانے کے بعد ارسلان بھائی سونے کے لئے چلے گئے۔ میں اور زرینہ ڈرائنگ روم میں آگ کے سامنے بیٹھے سوچ بچار کر رہے تھے۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ بنگال اتنا جاڑا بھی پڑ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ بیرے نے لکڑی کے کندے آگ میں ڈالے اور کافی کی میز بیگم صاحب کے سامنے حاضر کی۔ "بتیاں بجھا دو۔" زرینہ نے اس سے کہا۔ وہ روشنیاں بجھا کر اور پردے برابر کر کے دبے پاؤں باہر چلا گیا۔ وسیع گہرے کمرے میں اب صرف آتشدان کے شعلوں کی روشنی پھیل رہی تھی۔ قہوہ بناتے ہوئے جب زرینہ کا سایہ دیوار پر پڑا تو میں نے جانا کہ وہ شہرزاد کا سایہ ہے۔ اس لئے میں نے اس سے کہا "عزیزہ۔ کیا تم راحت کا نشانی کے سلسلے میں کچھ روشنی نہیں ڈالو گی۔"

اسکریپٹ کے کاغذات قریب ایک تپائی پر پڑے تھے۔ ان پر

ایک نظر ڈال کر اس نے کہا "ہاں"، ہیں یہ چھائیں کو دیکھتی رہی جس کے ہونٹ ہلے۔ اور داستان شروع ہوئی۔

" فلیش بیک۔ اسے خوش خصال، نیک خو، پیریدہ موعزیزہ

؎ عشق ہے تازہ کار تازہ خیال ہر جگہ اس کی اک نئی ہے۔
چال۔ کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے۔ کہیں یہ خوں چکاں حکایت ہے۔

" سبحان اللہ۔" میں نے کہا۔

" بی بی۔ بلبل نوا سنج ہزار داستان طوطی زمزمہ ریز خوش بیاں گلشن تقریر بس یوں چہکا ہے کہ عرصہ پچیس سال کا ہوا کہ عروس البلاد کلکتہ میں تین دوست رہتے تھے کہ تینوں ایک جاں تین قالب تھے۔ نام ان کے شمشاد، قاسم اور واحد تھے۔ تینوں مشرقی یو۔ پی کے اپنے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ جو عرصۂ دراز سے کلکتے میں بود و باش اختیار کر چکے تھے تینوں نے پریذیڈنسی کالج میں اکٹھے پڑھا اور جنگ شروع ہوئی تو شمشاد اور واحد اکٹھے ہی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ شمشاد کا تقرر شیلانگ میں ہوا۔ وہ ان تینوں میں سب سے بڑا تھا۔ واحد کے محاذ سے لوٹنے کے بعد کلکتے میں پوسٹنگ ہوئی۔ قاسم جو انجینیر تھا۔ وہ سروے میں ملازم ہو گیا۔ اب اس معبود حقیقی کی مصلحتوں کے قربان جائیے کہ شیلانگ میں ڈاکٹر ظفر علی بھی رہتے تھے۔ کہ جو درحقیقت باشندے لکھنؤ کے تھے۔ مگر مدت مدید سے

آسام میں پریکٹس کر رہے تھے۔ ان کی بیوی انگریز تھیں اور اکلوتی لڑکی صادقہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ میجر شمشاد نے جب صادقہ کو دیکھا تو ہزار جان سے اس پر عاشق ہوا اور فوراً پیغام مناکحت اس کے والدین کو بھجوایا۔ ڈاکٹر مظفر علی میجر شمشاد کے گھر والوں سے اچھی طرح واقف تھے اور لڑکا نہایت معقول تھا۔ لہٰذا پیغام منظور کر لیا گیا۔ اور صادقہ نے ابھی سینیر کیمبرج بھی نہ کیا تھا کہ اس کی شادی میجر شمشاد سے ہوگئی جو پرستش کی حد تک اسے چاہتا تھا۔ اپنے نام کی مناسبت سے اس نے اپنی لاڈلی بیوی کا نام صنوبر رکھا اور دونوں ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے۔ چھٹیاں گزارنے کے لئے واجد اور قاسم بھی کلکتے سے شیلانگ یا دارجلنگ آجاتے صنوبر گھر بھاوج کی حیثیت سے ان کی خاطر بس کرتی اور دونوں کے بیاہ کے لئے لڑکیاں ڈھونڈتی پھرتی۔ لیکن جب صنوبر کو معلوم ہوا کہ قاسم کی شادی ہو چکی ہے اور اس کی بیوی پٹنے اپنے میکے میں رہتی ہے۔ تو اسے بڑا غصہ آیا کہ اس نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ اس پر قاسم نے قہقہہ لگا کر خوب اسے بنایا اور اس کی سہیلیوں کے لئے طرح طرح کے مذاق کئے۔ قاسم تم سمجھ گئی ہوگی کہ ایک بہت دلچسپ نوجوان تھا۔ "رہ گیا واجد — تو اب کچھ عرصے سے وہ شادی کے نام پر چپ ہو جاتا۔ قاسم صنوبر سے کہتا کہ یہ بڑا گھاگ ہے۔ اس نے کلکتہ میں کوئی سلسلہ شروع کر دیا ہے اور شمشاد جو ایک بے حد محبت بھرے دل کا مالک تھا۔

اپنے دونوں دوستوں کو سگے بھائیوں سے زیادہ سمجھتا تھا۔

" اب بہن تم کو ایک بات بتا دوں،" زرینہ نے شال لپیٹتے ہوئے کہا۔

" یہ چاروں شمشاد، صنوبر، قاسم اور واجد سب ہی اوسط درجے کے لوگ تھے۔ ان کو کتابوں سے خاص دلچسپی نہ تھی۔ سیاسی شعور یا آرٹ و آرٹ سے کوئی ربط نہ تھا۔ ہلکے پھلکے لوگ تھے۔ جو اس طبقے میں ہر جگہ نظر آتے ہیں اچھی ملازمتیں، مستقبل کی ترقی اور آسائش ان کی زندگیوں کے محور تھے۔ صنوبر بھی سیدھی سادی لڑکی تھی اور سوز کو بہت بھٹے کی لکھنوی بیگم سمجھنے کی شوقین تھی۔ قصّہ کوتاہ چاروں اپنی اپنی جگہ بہت شریف اور ڈھنگ کے لوگ تھے ان میں آوارہ یا گھٹیا کسی کو نہیں کہا جا سکتا۔

" پھر صنوبر اور شمشاد کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا اور ان کی ازدواجی مسرت کی تکمیل ہو گئی۔ کئی سال گزر گئے جنگ کے اخیر دنوں شمشاد قاہرہ بھیج دیا گیا۔ قاسم ایک جہاز راں کمپنی میں کام کر رہا تھا۔ شمشاد قاسم سے کہتا گیا کہ وہ وقتاً فوقتاً اگر صنوبر کی خبرگیری کرتا رہے۔ جو شیلانگ میں تھی۔

" اس دوران میں یعنی شمشاد کی غیر موجودگی میں وہی ہوا جس کے لئے رومانی ناولوں کی زبان میں کہا جاتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے بے حد قریب آ گئے اور جب شمشاد معز بی محاذ سے لوٹ کر آیا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کی بیوی اور اس کے لاڈلے دوست کے درمیان ایک بہت

گمراجذباتی رشتہ قائم ہوچکا ہے۔

" شمشاد بڑا اصول پرست، کم گو اور ٹھوس بلکہ ٹھس قسم کا انسان تھا۔ جب یہ قصّہ چھاؤنی میں اسکنڈل بن کر گشت کرنے لگا تو اس نے سروس پستول نکال کر ارادہ کیا کہ پہلے صنوبر کو مار ڈالے اور پھر خود کو ہلاک کر دے۔ صنوبر نے اس سے طلاق مانگی مگر وہ تو مارنے مرنے پر تلا ہوا تھا۔"

" وارجیلنگ اور کلکتے سے دونوں کے والدین نے آکر صلح صفائی کرائی اور صنوبر نے قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اب وہ قاسم سے نہیں ملے گی۔ شمشاد چونکہ ایک اصول پرست اور راست باز انسان تھا۔ اس نے بیوی کی قسم پر اعتبار کیا۔ مگر ہوا یہ کہ اب صنوبر اور قاسم دریائی راستوں پر، خالی اسٹیمروں اور تنہا ڈاک بنگلوں میں چھپ چھپ کر ملنے لگے۔ کہ آسام اور بنگال کے گھنے رومینٹک جنگل اور دریا اس طرح کی ملاقاتوں کے لئے بے حد آئیڈیل ہیں۔

" صنوبر کا بچہ اب چار سال کا ہوچکا تھا۔ شمشاد بچے پر بھی عاشق تھا اور صنوبر کو اس کی حرکتوں کے باوجود اب بھی بے حد چاہتا تھا۔

" ایک دن اگرتلہ گھاٹ پر اس نے صنوبر اور قاسم کو اکٹھے دیکھ لیا۔ اور جب صنوبر سیلانے واپس پہنچی تو اس کی بری طرح کھدائی کر ڈالی۔ صنوبر نے دوبارہ طلاق کا مطالبہ کیا اور پہلے سے زیادہ مار کھائی۔

" اس مار پیٹ کا سلسلہ بہت دنوں تک چلتا رہا۔ آخر ایک رات جب شمشاد باہر گیا ہوا تھا صنوبر نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا۔

" اس رات چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ آسام کی برسات کی رات تم نے دیکھی ہے ــــ؟ جو محبت کرنے والوں کے لئے قیامت آفریں اور نامرادوں کے لئے پیغام ہلاکت بن کر آتی ہے۔ چنانچہ صنوبر نے بچے کو بہت سی ٹافی دے کر اور جی بھر کے رونے اور پیار کرنے کے بعد آیا کے ساتھ ننّا گرد پلینٹے میں بھیج دیا۔ اور پھر اس نے ایک پرچہ لکھا" تم مجھے علیحدہ کرنے پر تیار نہیں اور قاسم کے بنا زندہ رہنے کا اب میرے لئے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس جانکنی کی تکلیف سے چھٹکارا پانے کا ایک ہی راستہ مجھے سجھائی دیا ہے۔ بھیا کا خیال رکھنا۔ خدا حافظ۔

یہ دلدوز خط لکھنے کے بعد اس نے بچے کے کھلونوں، جوتوں اور کپڑوں کو بلک بلک پیار کیا۔ پھر آنسو پونچھ کر پرچہ شمشاد کے سرہانے کی میز پر رکھا۔ خواب آور گولیوں کی شیشی الماری سے نکالی اور گلاس میں پانی انڈیلا۔

" عین اسی وقت بیڈ روم کا دروازہ بھڑ سے کھُلا۔"

" زرینہ تمہارا جواب نہیں۔" میں نے داد دی۔

" اس قدر جان لیوا کلائمکس کی آپ منظر کشی فرما رہی ہیں اور کیا بھڑ سے دروازہ کھولا ہے۔ سبحان اللہ۔"

"ستو تو چپکی بیٹھی ـــ تو جناب دروازہ کھلا اور کوئی تا پھاند تا بھیا تیر کی طرح اندر داخل ہوا اور صنوبر دھک سے رہ گئی۔ بچے نے ماں کی ٹانگوں سے لپٹ کر کہا ممی - ممی - ذرا یہ فیتہ باندھ دو۔ مجھ سے بندھ نہیں رہا ـ اور اپنی ننھی سی کلائی پیش کر دی۔ گلابی پلاسٹک کی مصنوعی گھڑی اس کے دوسرے ہاتھ میں تھی۔ جو اسے غالباً آیا نے تحفتاً دی تھی۔

"اس لمحے اپنے بیٹے کو دیکھ کر وہ موت کو یکسر بھول گئی اور زندگی کی طرف لوٹ آئی۔ خط پھاڑ کر پھینک دیا اور شمشاد کے لئے کھانے کی دیکھ بھال کرنے باورچی خانے میں چلی گئی۔

"لیکن صبح کو اس نے شمشاد کے دفتر جانے کے بعد اسباب باندھا، اور بچے کو ساتھ لے کر دارجلنگ روانہ ہو گئی۔ وہاں اس نے اپنے والد ڈاکٹر ظفر علی کے سامنے پاؤں جوڑے کہ وہ خلع حاصل کرنے میں اس کی مدد کریں وہ ایک نہایت وضعدار آدمی ہیں۔ انہوں نے اسے خاندانی عزت اور اپنے سمدھی سے اپنی چالیس برس پرانی دوستی کا واسطہ دیا۔ اور اس سے التجا کی کہ وہ شمشاد کے پاس واپس چلی جائے کیونکہ یہ واقعہ تھا کہ قصور سراسر صنوبر کا تھا۔ شمشاد اس کے لئے آئیڈیل شوہر ثابت ہوا تھا۔ مگر ہے یہ وہ آتش غالب - وغیرہ وغیرہ - چنانچہ صنوبر کلکتے گئی اور چند دوستوں کی مدد سے عدالت میں خلع کی درخواست دے دی۔ مقدمے تے

نہایت طول کھینچا۔ یہاں تک کہ تقسیم ہند کا زمانہ آن پہنچا۔ تقسیم کے چند ماہ بعد صنوبر نے خلع حاصل کر لیا۔ لیکن اسے اپنے بچے سے دستبردار ہونا پڑا۔ بچہ اب اپنی دادی اور پھوپھیوں کے ساتھ ڈھاکے میں تھا جہاں شمشاد کے گھر والے کلکتے سے ترک وطن کر کے آ چکے تھے۔ شمشاد کچھ عرصے بعد فوج سے ریلیز حاصل کر کے کسی قسم کی اعلیٰ ٹریننگ حاصل کرنے امریکہ چلا گیا۔ کلکتے میں صنوبر اور قاسم کی شادی ہو گئی۔

"بی بی ۔۔۔ اب یہ نکتہ یاد رکھو کہ قاسم نے اپنی پہلی بیوی کو جو مستقل پٹنے میں رہتی تھی طلاق نہیں دی تھی۔ کیونکہ وہ اس کے سگے چچا کی اکلوتی اور صاحب جائداد لڑکی تھی۔ اب قاسم کی دوسری شادی نے جائداد کے سلسلے میں بھی قانونی پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ اور اس کے چچا یعنی سسر نے اس پر دعویٰ دائر کر دیا۔ جانے کیا قضیہ تھا۔ اس کی مجھے تفصیل معلوم نہیں۔ ان سب مصیبتوں سے بچنے کا بہترین راستہ یہ تھا کہ وہ ہندوستان کو خیرباد کہے۔ چنانچہ اس نے آسام کی جہاز راں کمپنی سے اپنا تبادلہ مشرقی پاکستان کی ایک جہاز راں کمپنی میں کروا لیا۔ اور دونوں دولہا دلہن ڈھاکے آ گئے۔

"واجد بھی کلکتے سے اوپٹ آؤٹ کر کے ڈھاکے آچکا تھا اور فوج چھوڑنے کے بعد ایک سول ملازمت میں شامل ہو گیا تھا۔

„ ڈھاکے میں صنوبر نے اپنا نیا گھر بھی اسی خوش سلیقگی اور نفاست سے سجایا جس طرح وہ آسام میں اپنے بنگلے دلہن کی طرح سجاتے رکھتی تھی۔ وہ ایک بڑی مرنجاں مرنج اور خاموش طبیعت لڑکی ہے اور اسے دیکھ کر کسی کو یقین نہیں آسکتا تھا کہ اس نے سر پہ کفن باندھ کر ایسا طوفانی اور بلاخیز عشق کس طرح کر ڈالا تھا۔ بہر حال اب وہ بیگم شمشاد کے بجائے بیگم قاسم تھی اور بے حد مسرور تھی۔

واجد ملازمت کے سلسلے میں نارائن گنج میں مقیم تھا۔ مگر ویک اینڈ گزارنے کے لئے صنوبر اور شمشاد کے یہاں آجاتا تھا صنوبر اس کے پیچھے پڑ گئی کہ پاکستان بننے کے بعد ڈھاکے میں سارے برصغیر سے آئے ہوئے اچھے اچھے خاندانوں کی ریل پیل ہے اور ایک سے ایک خوبصورت لڑکیاں یہاں موجود ہیں۔ اب اسے ضرور بیاہ کر لینا چاہیئے۔ مگر واجد حسب سابق اس کی بات ہنس کر ٹال جاتا اور قاسم صنوبر کو یاد دلاتا کہ واجد بڑا گھاگ ہے۔ اس کا کلکتہ والا سلسلہ ابھی تک غالباً چل رہا ہے۔ یہ پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دے گا۔

" اس بات پر واجد معنی خیز نظروں سے اسے دیکھ کر کہتا۔ ابے چُپ ہو جا یار —— اگر اپنی خیریت چاہتا ہے۔ اس پر دونوں دوست خوب قہقہہ لگاتے اور صنوبر اس پراسرار مذاق کو نہ سمجھ پاتی۔ مگر خود بھی ہنسی میں شامل ہو جاتی۔"

" اکثر وہ بچے کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے کار سے جاکر اس کے اسکول کے باہر کھڑی کر دیتی اور بچے باہر نکلتے تو صبر سے اپنے بیٹے کا انتظار کرتی رہتی۔ مگر جب وہ قریب سے گزرتا تو جلدی سے آنچل منہ میں ڈال کر کار اسٹارٹ کر دیتی۔ اسے معلوم تھا کہ شمشاد نے بچے سے کہہ رکھا ہے کہ اس کی ممی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اسکول سے لوٹ کر وہ پہروں روتی۔ تب قاسم اس پر برس پڑتا۔

" علامہ اشتد الخیری کی اس ٹریجک ہیروئن نے خدا کی قسم اب مجھے بور کر دیا ہے۔ وہ کہتا۔۔۔۔ وہ اور زیادہ بلک بلک کر روتی۔ تب واجدا سے بڑے پیار سے سمجھاتا۔ تم اپنی کشتیاں جلا چکی ہو۔ اب قاسم سے لڑائی جھگڑے شروع نہ کر دینا۔ کہیں کی نہ رہو گی۔ وہ مزید روتی اور واجدا سے مزید دلاسے دیتا۔

" پھر یہ ہوا کہ صنوبر کے یہاں توام لڑکیاں پیدا ہوئیں اور وہ بیٹے کی مفارقت کا دکھ بھول کر اُن بچیوں میں محو ہو گئی۔ ڈاکٹر ظفر علی شیلانگ میں تھے اور صوبائی سیاست میں نمایاں حصہ لے رہے تھے صنوبر کی والدہ شیلانگ سے آکر ڈھاکے میں بیٹی داماد کے پاس قیام کرتیں اور نواسیوں سے لاڈ پیار میں لگی رہتیں۔ یوں خاصی مطمئن اور خوش باش زندگی صنوبر اور قاسم کی گذر رہی تھی۔"

" پھر ایک بے حد معمولی سا واقعہ ہوا، بی بی تم وقت کی بات جو کہہ رہی ہو تو میری

سُنو۔"

"ایک چھوٹا سا سفر — ایک بظاہر غیر اہم ملاقات، ایک منظر سرسری جھلک ایک مختصر سا خط، ایک تحریر، بے دھیانی میں کہے ہوئے چند الفاظ۔ زندگی کا دھارا بدل دیتے ہیں۔ ایک لمحہ جہنم کو جنت اور جنت کو جہنم میں تبدیل کرنے پر قادر ہے ایک لمحہ — صرف ایک لمحہ۔ بی بی۔"

"ایک روز قاسم نے دفتر سے گھر آکر صنوبر سے کہا کہ اُسے ایک سرکاری وفد کے ساتھ بمبئی بھیجا جا رہا ہے۔ کسی کانفرنس کے لئے اور اس نے صنوبر کو الٹی میٹم دیا کہ وہ فوراً تیار ہو جائے۔ صنوبر بمبئی کی سیر اور شاپنگ کے خیال سے کھل اُٹھی۔ بچوں کو اپنی والدہ کے حوالے کیا اور خوش خوش طیارے میں بیٹھ کر قاسم کے ساتھ بمبئی پہنچی۔

"وفد کے اراکین تاج محل ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔ ایک رکن نے اپنے ایک مقامی دوست سے کہا کہ وہ کسی فلم کی شوٹنگ دیکھنا اور نرگس سے ملنا چاہتے ہیں۔ مقامی دوست نے جواب دیا کہ وہ ابھی اپنی دوست مسز سروپ کمار کو فون کئے دیتے ہیں۔ وہ آپ سب کو نگار خانوں کی سیر بھی کرائیں گی اور نرگس راج کپور، دلیپ کمار سب سے ملوا بھی دیں گی اور بیگم قاسم، انہوں نے صنوبر کو مخاطب کیا، مسز سروپ کمار اور ان کی ہمشیرہ مس کاشانی ساریاں خریدنے کے سلسلے میں آپ کی بہترین گائیڈ ثابت ہوں گی۔"

"لہذا ان دونوں خواتین کو فون کیا گیا اور صنوبر اُن کے ساتھ باہر جانے کے لئے تیار ہوگئی۔"

"تب ایک عجیب بات ہوئی۔ قاسم نے اچانک اس سے کہا کہ اسے ان لوگوں کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ کانفرنس سے لوٹ کر شام کو اسے خود باہر گھمالائے گا صنوبر نے اپنے اکسائٹمنٹ میں اس بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ تو نرگس اور مینا کماری کی فلموں کی شوٹنگ دیکھنے کے لئے مری جا رہی تھی۔ چنانچہ قاسم اور دوسرے پاکستانی انجینیئر کانفرنس کے لئے روانہ ہوگئے۔ کچھ دیر بعد ایک تازہ ترین ماڈل کی امریکن کار تاج کے سامنے آن کر رُکی اور وہ بے حد فیشن ایبل لڑکیاں ہنستی کھلکھلاتی اُتریں اور صنوبر سے جو اُن کے انتظار میں برآمدے میں کھڑی سمندر اور جہازوں کو دیکھ رہی تھی، اپنا تعارف کرایا۔ فرحت سروپ کمار اور راحت کاشانی۔

"بی بی ۔۔۔ اس نکتے پر پہنچ کر یہ خاکسار ایک دوسرا فلیش بیک شروع کرتی ہے۔ یعنی فلیش بیک در فلیش بیک ۔۔۔ صنوبر کی کہانی اس نکتے تک ذہن میں محفوظ رکھو۔ کس نکتے تک ۔۔۔؟"

"کہ دو بے حد فیشن ایبل لڑکیاں تاج کے سامنے آکر اُتریں۔" میں نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

"ہاں ۔۔۔" زرینہ نے گلا صاف کیا اور نئی کافی تیار کرنے کے بعد کہانی

جاری رکھی۔

"تم کو یاد ہوگا بی بی۔ جب ابا میاں کا تبادلہ لکھنؤ سے کلکتے کا ہوا تھا۔ تو میں انٹرسائنس کے لئے لیڈی برابورن کالج میں داخل ہوگئی تھی۔ یاد ہے نا ــــــ؟ اچھا ــــــ تو ایک مرتبہ کیا ہوا کہ ہم کالج میں ایک ہندوستانی ڈرامہ اسٹیج کرنے والے تھے تو ہماری ایک ہم جماعت انجم آرا نے کہا کہ اس کے ماموں کے ایک دوست ہیں۔ واجد صاحب۔ واجد صاحب کہ کے۔ ان واجد صاحب کی ایک بے حد گلیمرس گرل فرینڈ ہے۔ جو بہت اچھی ایکٹرس ہے اور سفر کے تھیٹریکل حلقوں میں اس کی ڈائرکشن کی صلاحیتوں کو بھی بہت سراہا جا رہا ہے۔ میں اسے بلواتی ہوں کہ ہماری مدد کرے۔

"اب یہ لمبا چوڑا تعارف دراصل ایک ایسی حسینہ نازنین کا تھا جو کلکتے میں تو بے حد مشہور تھی مگر بسم اللہ کے گنبد میں پلی ہوتی ہم بے وقوف اور نو عمر لڑکیوں کے لئے اس وقت تک اس کا نام اجنبی تھا۔ یہ زہرہ جبیں فخر بتستان ان لندن وچین ماہر وعنبرین موسر گروہ خوباں سہاں جاں جان آرام دل دل منشا قال کہ نام اس کا راحت کا شانی تھا۔ سال بھر قبل کو ئٹے سے آئی تھی اور وار پبلسٹی کے محکمے میں اسسٹنٹ انفرمیشن آفیسر بقول شخصے لگی ہوتی تھی۔

"اس کے بارے میں طرح طرح کی رومانٹک روایتیں مشہور ہوگئی تھیں۔ جن کی وجہ سے اس نے سارے میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔"

"مس کاشانی کی دوسری تہلکہ خیزی کی وجہ ایک اور تھی۔"

"مجھ کو خوشی ایک اور ہے لاناتو اور ایک جام مے
ہاں ہاں مسلماں زادیاں ہوتی ہیں عفت والیاں
چشم فلک نے آج تک دیکھی نہیں ان کی جھلک"

یں نے زرینہ کی بات کاٹ کر آنکھیں بند کر کے پڑھنا شروع کر دیا۔ اور "جھلک" اتنے زور سے ادا کیا کہ زرینہ اپنی جگہ سے اُچھل پڑی۔ پھر اس نے اسی روانی سے کہانی جاری کر دی۔ وجہ ایک اور تھی۔ آج برصغیر اتنا آزاد ہو چکا ہے۔ ماشاء اللہ ـــ اور اب یہ انوکھی بات نہیں رہی۔ مگر اس وقت تک وطن عزیز اس قدر ماڈرن نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ حسینہ ناز بننے سے لو مٹر سرکلر روڈ کو پیرس کا لیٹن کوارٹر گردانتی تھی اور واحد صاحب کے ساتھ رہا کرتی تھی۔

"چنانچہ آئندہ اتوار ہمارا ڈرامہ گروپ زولوجیکل گارڈن میں ایک جھیل کے کنارے کنج میں جمع ہوا اور وقت مقررہ پر مس کاشانی وہاں تشریف لائیں ڈرامے کی پہلی ریڈنگ کروائی گئی مجھے اب تک یاد ہے۔ ڈرامہ عصمت آپا کا "خالہ بی تھا" اور بڑے وقار اور متانت سے ہم لونڈیوں سے باتیں کرتی رہیں۔

"دوسرے اتوار کو ہم کالج ہال میں ریہرسل کے لئے اکٹھے ہوئے مگر مس کاشانی نہ آئیں۔ کچھ دیر بعد انجم آرا نے منہ لٹکاتے ہوئے آکر خبر دی کہ ایک بڑا واقعہ ہو گیا ہے۔ راحت آپا واحد چچا کے والدین کے گھر گئی تھیں۔ وہاں

واجد چچا کی بہنوں نے ان پر چوری کا الزام لگا کر ان کو مکان سے نکال دیا۔

"گڈ گاڈ ــــ آل مائیٹی جیزس۔ گڈ لس گریشس ــــ،" حیرت زدہ آوازوں کا کورس بلند ہوا۔

"مگر چوری کا الزام کیوں ــــ ؟" میں نے پوچھا۔

"حالانکہ تم کو پتہ بھی ہے۔ راحت آپا فلاں کے فقیروں کی بیٹی ہیں ــــ" انجم آرا نے کہا۔

"فقیروں کی ــــ یعنی صوفیوں کی ــــ" میں نے پوچھا۔

"ارے نہیں بھائی ــــ فقیر جو رنگ برنگی مالائیں پہنے درگاہوں پہ بس بیٹھے بیٹھے اللہ اللہ کرتے ہیں اور چمن۔ بوستان اور زاہدان میں راحت آپا کے والد کے ذاتی تاکستان ہیں"

"اوہ ہاؤ ویری فیبلولس"

"لیکن راحت آپا کی امی خانہ بدوش ہیں۔ انجم آرا نے بڑے ڈرامائی انداز میں دوسری اطلاع دی یعنی جپسی۔ اور فورٹ سنڈیمن اور لورالائی سے لے کر تربت تک ان کے قبیلے کے کاروانوں کی گھنٹیاں صحرا کی چاندنی میں گونجتی رہتی ہیں۔ راحت آپا کے نانا بلوچی خانہ بدوشوں کے سب سے بڑے قبیلے کے سردار ہیں اور بے حد دولت مند۔ اونٹوں گلے اور جناب ایرانی قالینوں کے سجے ہوئے خیمے اور تلواریں۔ بندوقیں۔ مگر واجد چچا کی بہنوں نے یہ سب

نظر انداز کر کے طعنہ دیا کہ تم آخر ہو کون ـــ اُٹھائی گیری۔ اُچکی ــ اِدھر اُدھر ڈاکے ڈالتی پھرتی ہو ـــ تباہ و برباد کر ڈالتی ہو لوگوں کو ـــ اب بتاؤ بھلا بے چاری راحت آپا کو کیسے چوٹ ڈاکو بنا دیا۔

" ہم سب راحت کا نشانی کے اس الف لیلوی پس منظر سے مسحور ہوئے اور ببانگِ دہل اعلان کیا کہ واجد چچا کی بہنوں کو ایسی غلط اور افسوس ناک ہرگز نہ کہنا چاہیئے تھی۔

راحت کا نشانی ایک دم غائب ہو گئیں۔ اور " خالہ بی " ان کے ڈائریکٹن سے فیضیاب نہ ہو سکا۔ لیکن ڈیڑھ دو مہینے بعد ایک صبح انجم آرا نے لیبارٹری میں داخل ہوتے ہی اطلاع دی کہ راحت نے مٹیا برج کے ایک انتہائی لوفر نواب زادے سے شادی کر لی اور اس کے چار دن بعد ہی اس سے طلاق لے لی۔ اس حیرت انگیز واقعے کی وضاحت انجم آرا نے یوں کی کہ راحت نے واجد چچا سے کہا کہ وہ اس سے شادی کر لیں۔ مگر واجد چچا نے منع کر دیا اور کہا کہ وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔ مگر اس کی عزت نہیں کرتے۔"

" بھئی اس کا یہی مطلب ہوا کہ آدمی اس لڑکی سے شادی کرتا ہے جس کے لئے اس کے دل میں عزت ہو۔"

" مگر پھر محبت کیوں کرتے ہیں۔ ؟"

" یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ ہم لوگ اس وقت کتنے بھولے اور

احمق تھے۔ آج کل کی لڑکیوں کو دیکھو۔ کھاگ ایک سے ایک ۔"

" اچھا زرینہ بی بی تم اپنے فٹ نوٹ رہنے دو۔ قصّہ سناؤ ۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔" مجھے صبح سویرے وکیشن ڈھونڈنے جانا ہے ۔"

" اچھا اچھا رُعب مت ڈالو ۔۔۔ ہاں تو میں کیا بتا رہی تھی ۔؟"

" لوفر نواب زادے سے طلاق لے لی ۔"

" ہاں ۔۔۔ اور ٹالی گنج میں فلیٹ لے لیا۔ کیونکہ اب اس کی چھوٹی بہن فرحت بھی کالج کی تعلیم ختم کر کے کوئٹے سے کلکتے آگئی تھی۔ فرحت کافی معمولی شکل کی لڑکی تھی۔ مگر انجم آرا نے کہا کہ چھوٹے ماموں کہتے ہیں فرحت کا شانی میں گھڑوں سکیس اپیل ہے ۔"

" اب دونوں بہنوں نے مل کر شہر کو انگریزی محاورے کے مطابق سُرخ رنگ دیا ۔"

" انہی دنوں قاسم جو دریائی ملازمت کے سلسلے میں آسام میں تھا کلکتے آیا۔ اس وقت صنوبر سے اس کا عشق شروع نہیں ہوا تھا۔ کسی محفل میں فرحت کاشانی سے اس کی ملاقات ہوئی اور فرحت اس کی محبوبۂ دلنواز بن گئی۔ پھر وہ شیلانگ گیا اور شمشاد کی غیر حاضری میں صنوبر سے عشق کرنے لگا۔ مگر ہر مرتبہ جب وہ کلکتے آتا تو فرحت بھی اس کی رفاقت کرتی۔ جب تک صنوبر سے شادی کر کے وہ ڈھاکے نہیں گیا۔ اس وقت تک فرحت

کھلتے ہی ہیں رہی۔ لیکن صنوبر کو اس کے وجود کا مطلق علم نہ تھا۔ حوالے کے لئے پچھلا فلیش بیک یاد کرو)

"پھر بی بی میں انٹر سائنس کر کے لکھنؤ میڈیکل کالج چلی گئی۔"

"ایک روز ریڈنگ روم میں ایک فلمی رسالے پر نظر پڑی تو اس میں راحت کاشانی کی تبسم تصویر موجود تھی۔

"اب آگے کا سنو احوال"

"تقسیم ہند کے فوراً بعد انجم آرا شادی کر کے لکھنؤ آ گئی اور اس نے بتایا کہ واجد چچا ڈھاکے چلے گئے ہیں اور راحت اور فرحت نے بمبئی جاکر فری لانسنگ شروع کر دی ہے۔"

"کاہے کی فری لانسنگ ـــــ؟" میں نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا۔

"اداکاری اور دیگر فنونِ لطیفہ ـــــ" انجم آرا نے بڑے گھاگ پن سے جواب دیا۔ شادی سے پہلے کتنی معصوم تھی یہ بچی۔ میں نے سوچا۔

"وہ دونوں فلمی دنیا میں اس طرح داخل ہو گئی ہیں جس طرح بطخ پانی میں تیرنے لگتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اُن کی شکلیں کیمرے کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ اس لئے بڑی فلم اسٹار کبھی نہ بن سکیں گی۔" انجم آرا نے کہا۔

"آزادی کے بعد دونوں ملکوں میں نیا دولت مند طبقہ اُبھرا حصولِ زر جس کا

جس کا واحد آدرش تھا اور جو ہر قسم کی تہذیبی اور اخلاقی اقدار سے بے بہرہ اور بے تعلق تھا۔ شراب نوشی، فیشن ایبل عیاشی اور ریاکاری کے اس عظیم الشان دور نے ایسی روایات کو جنم دیا۔ جن کے آگے بے چاری راحت کا نشانی بھی ماند پڑ گئی۔ اب راحت اور فرحت کا ٹاٹ پٹ الو کا نہیں رہا تھا

"اسی زمانہ میں سروپ کمار جو بمبئی میں بڑا سخت فلمی ہیرو لگا ہوا تھا۔ فرحت کے عشق میں گرفتار ہوا ـــ اور اس سے سول میرج کر لی۔ راحت نے ایک غیر فلمی ہیرو سے گویا گندھرواہ کر لیا اور مسز غیاث الدین کہلانے لگی۔ پھر یکا یک مسٹر غیاث الدین انگلستان چلے گئے۔ راحت بمبئی کے ترقی پسند حلقے سے بھی ربط رکھتی ہیں اور جب غیر ملکی فلمی یا تہذیبی وفد شہر میں وارد ہوتے تو راحت ہی ان کے استقبال میں پیش پیش رہتی۔ مگر فلم انڈسٹری کے اندر اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یہ اس کے لئے بہت بڑا المیہ تھا۔ احمق الذہن، خالی الذہن لڑکیاں چوٹی کی فلم اسٹار بن کر لاکھوں کما رہی تھیں اور ایک عالم میں مشہور ہو گئی تھیں۔ مگر راحت اپنے غیر معمولی حسن، ذہانت، فنی صلاحیت اور اخلاقی آزادی کے باوجود کچھ نہ بن سکی۔ اس احساس محرومی اور ناکامی کی تلافی کے لئے وہ تلوار کی دھار پر سے گزر گئی۔

"پھر سروپ کمار ایک فلمی ڈیلی گیشن کے ساتھ جاپان چلا گیا اور اپنی بہن کی دوسرا تھ کے لئے راحت سروپ کمار کے نیپین سی روڈ کے عالی شان فلیٹ

بس آن کر رہنے لگی۔

(سروپ کمار نے متعدد ریس گھوڑے اور دو لاکھ روپیہ بھی فرحت کے نام منتقل کر دیا تھا۔ اس میں بیوی کی چاہت اور انکم ٹیکس سے بچنے کی ترکیب دونوں مضمر تھے)

" ایک روز فرحت صوفے پر لیٹی آیا سے پاؤں دبوا رہی تھی اور راحت نیچے قالین پر اوندھی لیٹی کچھ پڑھ رہی تھی کہ سفید رنگ کے فون کی گھنٹی بجی اور تاج محل ہوٹل سے ایک دوست نے کہا کہ ڈھاکے سے کچھ مہمان آتے ہیں اور تم سے ملنا چاہتے ہیں۔۔۔ فوراً آؤ۔۔ چنانچہ دونوں بہنیں پریوں کی طرح سج کے تاج محل ہوٹل کو روانہ ہو گئیں۔ اور وہاں پہنچ کر صنوبر قاسم کو اپنا منتظر پایا۔

”آٹھ دن تک بڑے جشن رہے۔ صنوبر اور فرحت میں بے حد دوستی ہو گئی۔ فرحت نے ڈھیروں ساریاں اُسے تحفے میں دیں۔ مہمانوں کی خاطر و مدارات میں پانی کی طرح روپیہ بہایا کیونکہ روپیہ اس کے لئے اب کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا دن رات اس کی موٹریں صنوبر اور قاسم کی خدمت میں حاضر رہتیں۔“

”ڈھاکہ لوٹنے سے ایک دن قبل صنوبر دوستوں کے ساتھ اِلیفنٹا کی سیر کرنے کے لئے گئی۔ قاسم سرکاری کام کی وجہ سے نہ جا سکا۔ جزیرے پر پہنچتے ہی گروہ کی ایک خاتون کی طبیعت خراب ہو گئی اور دن بھر وہاں رہنے کے بجائے وہ سب دوسری لانچ سے واپس آ گئے۔ صنوبر ایک ٹیکسی لے کر اپالو بندر سے سیدھی فرحت کے یہاں روانہ ہو گئی۔ تاکہ بقیہ وقت وہاں گزارے۔

”جب وہ فلیٹ کے اندر پہنچی تو سارے میں دوپہر کا سنّاٹا چھایا ہوا تھا

راحت کسی فلم کی شوٹنگ کے لئے جا چکی تھی، حسب معمول صنوبر سیدھی فرحت کی شاندار خواب گاہ کی طرف چلی گئی اور ــــ،،

" پھر سے دروازہ کھولا ــــ،، میں نے بات کاٹی۔

" ہاں ــــ اور فوراً الٹے پاؤں لوٹی اور لفٹ تک پہنچتے پہنچتے لڑکھڑا کر گرنے لگی تو ایک گھاٹن نے اسے سنبھالا۔ صنوبر نے ہکلاتے ہوئے پوچھا کہ جو صاحب اندر ہے وہ پہلے بھی آچکا ہے ــــ؟،،

" گھاٹن نے ہونٹ پچکائے۔ مگر چونکہ فرحت نے کسی قصور پر اس کی دو ماہ کی پگار ضبط کرکے اُسے صبح ہی نوکری سے برطرف کیا تھا۔ لہٰذا اس نے جواب دینے میں نمک حرامی نہ سمجھی۔ اس نے کہا۔ ہاں بائی۔ صاحب تو ایک چھ سات دن سے روز آتا ہے۔ کبھی دن میں کبھی رات کو ــــ آنے کا ٹائم کوئی ٹھیک نہیں ہے باہر گاؤں سے آیا ہے ــــ کل چلا جائے گا ــــ،،

" صنوبر واپس تاج پہنچی اور جب شام کو قاسم نے کمرے میں داخل ہو کر کہا کہ وہ دن بھر کانفرنس میں مغز کھپاتے کھپاتے چور ہوگیا ہے تو صنوبر نے بڑے سکون کے ساتھ اس کے لئے کافی منگوائی اور اسے سریڈون کھانے کو دی ــــ،،

" کیونکہ اسے واجد کی بات یاد آگئی تھی۔ کہ وہ اپنی کشتیاں جلا چکی ہے ــــ،،

" ڈھاکہ واپس پہنچ کر بھی اس نے کبھی قاسم پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ کیا جانتی

ہے اور پرانے معمول کے مطابق زندگی گزارنے لگی —"

"اب بی بی اس داستان کا تیسرا باب شروع ہوتا ہے ۔"

زرینہ نے شال کو اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر صوفے پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔" میں لکھنؤ میڈیکل کالج سے ایم۔بی۔بی۔ایس کرنے کے بعد ۵۴ء میں گائناکولوجی میں ایم۔ڈی کرنے ایڈنبرا چلی گئی۔ وہاں سے واپس آکر بلرام پور ہسپتال میں کام کرنے لگی۔ کچھ عرصہ بعد مجھے میڈیکل کالج میں لکچررشپ ملنے والی تھی کہ اسی زمانے میں ڈھاکے سے بڑی آپا کے بڑے پُر اسرار سے خط اماں کے پاس آنے شروع ہوئے۔ تمہیں معلوم ہے۔ بھائی جان ۴۷ء سے ڈھاکے میں ہیں۔ وہاں ان دونوں کی ملاقات ارسلان احمد اور ان کے گھر والوں سے ہوتی اور بڑی آپا نے ترنت میرے رشتے کی بات چیت شروع کر دی۔ ادھر میں اپنے آئیڈیلیز لئے بیٹھی تھی کہ جنتا کی خدمت کروں گی۔ گاؤں میں جاکر کسانوں کا علاج معالجہ کروں گی۔ کچھ عرصہ تک میں نے کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروجیکٹ کے ساتھ بھی کام کیا اور اب میڈیکل کالج میں گائناکولوجی پڑھانے کی پیش کش کو فوراً قبول کر لیا۔ مگر بڑی آپا کے سامنے کس کی چل سکتی ہے۔ چنانچہ ابا میاں اور اماں نے مجھے زبردستی ڈھاکے چلتا کیا۔ ۵۵ء میں ڈھاکے آئی۔

"ارسلان مجھے بے حد پسند آئے۔ مگر شادی کا فیصلہ فوراً نہ کر سکی۔ تم

جانو دہی ٹو بی اور ناٹ ٹو بی TO BE OR NOT TO BE کا جان لیوا مسئلہ ــــــ بھائی جان میرے ویزا کی میعاد بڑھواتے رہیے۔ تاکہ میں اطمینان سے کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔

ان ہی دنوں ایک شام بھائی جان اور بڑی آپا کے ساتھ ان کے دوستوں مسٹر اور مسز سیڈرک وارنگٹن کے یہاں "کال" کرنے کے لئے گئی۔ یہ ایک معمر انگریز جوڑا تھا۔ مسٹر وارنگٹن مشرقی پاکستان کی ایک برطانوی جہاز راں کمپنی کے افسر اعلیٰ تھے اور بہت جغادری قسم کے انگریز تھے۔ ہم لوگ لان پر جاں کنر بیٹھے اور ملازم ہماری اطلاع کرنے کے لئے اندر گیا اور چند منٹ بعد کیا دیکھتے ہیں۔ ایک پری جمال لڑکی تیلیوں میں ملبوس برآمدے سے اُتر کر گھاس پر خراماں خراماں چلتی مسکراتی ہوئی ہماری طرف آرہی ہے۔

"جب وہ قریب پہنچی تو مجھے اسے پہچاننے میں کوئی وقت نہ ہوئی۔ وہ راحت کاشانی تھی جسے میں نے دس سال قبل کلکتے کے زولوجیکل گارڈن میں دیکھا تھا۔ اب وہ کوئی بتیس تینتیس برس کی رہی ہوگی۔ مگر پہلے سے بھی زیادہ دلکش اور اسمارٹ نظر آرہی تھی۔"

"اس نے خالص برطانوی انداز میں بڑے اسٹائل سے بات شروع کی اور کہا کہ سیڈرک اور ہلڈا ابھی باہر گئے ہیں اور وہ ان کی دوست اور ہاؤس گیسٹ ہے اور ہندوستان سے آئی ہے اور یہ کہ آپ لوگ

کیا بیٹیں گے۔"

" میں نے اسے کلکتے کی ملاقات یاد دلائی تو وہ خوشی کے مارے اچھل پڑی اور بے حد تپاک اور خلوص سے باتیں کرنے لگی اور کہا کہ وہ کل ہمارے یہاں آئے گی۔ میں نے اس سے بمبئی کے پروگریسو گروپ میں شامل دوستوں کی خیر خبر دریافت کی اور راحت کی باتوں سے ظاہر ہوا کہ وہ بڑے واضح سیاسی شعور کی مالک ہے۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے بین الاقوامی سیاست اور ادب وغیرہ کے متعلق تبادلہ خیالات کیا۔ اس کی معلومات کافی وسیع تھیں۔"

" پھر کچھ دیر تک دونوں ملکوں کے درمیان زر مبادلہ کی پابندیوں کا تذکرہ ہوتا رہا۔ اس نے کہا کہ ہندوستان سے صرف پچاس روپے لے کر پاکستان آنے کی اجازت ہے۔ اب ذرا سوچئے کہ میں صرف پچاس روپے لے کر یہاں پہنچی ہوں، کس قدر کوفت کی بات ہے۔ تھوڑی دیر میں میزبان بھی آگئے اور راحت جس طرح گھل مل کر ان کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ گویا وہ ان کے گھر کی ایک فرد ہے۔"

" دوسرے دن وہ ہمارے یہاں آئی اور بے حد دلچسپ گفتگو کرتی رہی یہ لڑکی لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے کا فن جانتی ہے۔" بڑی آپا نے اظہار خیال کیا۔

" کوئی پندرہ بیس دن بعد ایک روز مس فلیمنگ بڑی آپا سے ملنے آئیں

مس کلارا فلیمنگ ہلڈا اوارنگٹن کی بوڑھی کنواری بہن تھیں اور انگلستان سے چند ماہ کے لئے آئی ہوئی تھیں۔

" جیسا کہ میں نے تم کو ابھی بتایا وارنگٹنز بڑے جغادری قسم کے انگریز تھے اور انگریز اپنے ماں باپ بہن بھائی کو بھی اپنے گھر پر مہمان رکھنے کا قائل نہیں۔"

" دوسری چیز یہ کہ انگریز ہمیشہ انڈر اسٹیٹمنٹ میں بات کرتا ہے۔ چنانچہ کلارا فلیمنگ نے برسبیل تذکرہ کہا کہ ڈیڈ راحت ہمارے یہاں بہت ویلکم ہے اور وہ ایک نہایت ہر دلعزیز لڑکی ہے۔ اس وجہ سے اس نے یہاں آتے ہی آتے ان گنت دوست بنا لئے ہیں۔ مگر ذرا سی دقت یہ ہے کہ ان کے دوستوں کے وقت بے وقت ٹیلی فون آتے رہتے ہیں اور ہلڈا اعصاب کی مریض ہے۔"

" آپ لوگوں کی راحت سے بہت پرانی اور بے تکلف دوستی ہے۔ اسے سمجھا دیجئے کہ دوستوں کو منع کر دے۔" بڑی آپا نے کہا۔

" ہاں میرا یقیناً یہ خیال ہے کہ تم ٹھیک کہتی ہو بیڈرک اور ہلڈا دو مہینے قبل دہلی گئے تھے۔ وہیں پہلی بار ان کی ملاقات راحت سے ہوئی تھی اور اس پیاری بچی نے ان دونوں کی بہت خاطر مدارات کی بیڈرک نے اس سے کہا تھا کہ اگر کبھی وہ ڈھاکہ آئے تو ان کے یہاں ہی ٹھہرے تو وہ سچ مچ آ گئی اور میں سمجھتی ہوں کہ اس کی مہربان آمد ہم لوگوں کے لئے باعثِ مسرت ہے۔

میری بہن ہلڈا کے اعصاب اس مرطوب آب و ہوا کی وجہ سے بہت خراب ہو گئے ہیں۔ کلارا فلیمنگ نے آنکھیں چندھیا کر اپنی خلیق مسکراہٹ کا رخ میری طرف کیا۔ "کیا تمہارا یہ خیال نہیں ہے۔ مائی ڈیئر کہ بنگال اس موسم میں بہت صبر آزما ہو جاتا ہے ۔۔۔ ؟""

" اس بات کو ایک ہفتہ گزرا ہو گا کہ ایک صبح ہمارے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ راحت بول رہی تھی۔ میں شاہ باغ میں شفٹ ہو گئی ہوں۔ کسی وقت اِدھر آؤ۔ میں شام تک اپنے کمرے ہی پہ رہوں گی اور کمرے کا نمبر بتایا

" مجھے تعجب ہوا کہ یا اللہ یہ لڑکی پچاس روپے لے کر ہندوستان سے آئی تھی۔ شاہ باغ میں کیسے منتقل ہو گئی۔"

" شام کو میں ریس کورس روڈ پر سے گزر رہی تھی۔ تو راحت کے فون کا خیال آیا اور میں نے سوچا کہ اس کے پاس ہوتی چلوں۔ شاہ باغ ہوٹل کی دوسری منزل پہ راحت کاشانی کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ لہٰذا میں دستک دینے کے بعد اندر داخل ہو گئی۔ غسل خانے میں سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ جھل جھل کرتا لباس پلنگ پر رکھا تھا۔ کونے میں میز پر راحت کے دوسرے شوہر غیاث الدین کی تصویر اور ماڈرن آرٹ کے متعلق مغربی نقادوں کی چند کتابیں رکھی تھیں۔ سنگھار میز پر تازہ پھولوں کا گلدستہ مہک رہا تھا۔ ابھی گلدستے کا سرخ ریشمی فیتہ بھی اس میں موجود تھا۔

" ارے بھئی راحت "، میں نے آواز دی۔

" غسل خانے کا دروازہ ذراسا کھلا ہوا تھا۔ اس نے اندر سے جواب دیا۔ ہاں ہاں آجاؤ ـــــ یہیں آجاؤ۔

" میں یہ سمجھ کر کہ شاید وہ منہ ہاتھ دھو رہی ہے۔ اطمینان سے اندر چلی گئی۔ اور ہکّا بکّا اور بے حد نادم ہوئی۔"

" راحت کسی ہالی ووڈ ایکٹریس کی طرح ٹب میں نیم دراز تھی۔ ٹیلی فون پاس اسٹول پر رکھا تھا جس کا ریسیور اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں فوراً اُلٹے پاؤں واپس جانے کے لئے پلٹی تو اس نے بڑے اطمینان سے کہا آؤ ـــــ آؤ بیٹھو۔ دوسرے اسٹول کی طرف اشارہ کیا اور ٹیلی فون پہ بات کرنے لگی۔

" اب دیکھو بی بی ـــــ" میری کزن زرینہ نے ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر کہا۔" میں ڈاکٹر ہوں۔ برسہا برس میں نے بیشکٹروں ڈیلیوری کیس کئے ہیں طرح طرح کے آپریشن کرتے کی عادی ہوں۔ انسانی اناٹومی میرے لئے کسی نفسیاتی کمپلکس COMPLEX کی حیثیت نہیں رکھتی۔ تم خود غیر ملکی آرٹ اسکولوں کی لائف کلاس میں کام کر چکی ہو اور جانتی ہو کہ انسانی جسم کے متعلق سارا مسئلہ رویے کا ہے۔ ڈاکٹروں کا CLINICAL رویہ، شاعروں، سنگتراشوں اور مصوّروں کا جمالیاتی رویہ اور سیدھی سیدھی جنسی اپروچ جس میں صحت مند اور مریضانہ دونوں رویے شامل ہیں۔ یہ واقعہ کہ راحت نے مجھے غسل خانے

میں بلایا۔ اس کی جسمانی نمائش پسندی یعنی EXHIBITONISM کا غماز تھا۔ راحت کو اپنے خوبصورت جسم کا شاید احساس تھا۔

" میں اسٹول پر بیٹھ کر راحت سے باتیں کرنے لگی۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اور اس نے بڑی ادا سے پھر ریسیور اُٹھایا۔"

" تب مجھ پر اچانک ایک اور انکشاف ہوا۔ یہ مستقل دن کے خواب دیکھنے والی لڑکی شاید اس وقت یہ تصوّر کر رہی ہے کہ وہ میری لین مزو ہے اور ہالی ووڈ میں اپنے سونے کے ٹب میں وہاں شاید سونے چاندی ہی کے ٹب ہوتے ہیں نہا لیتی اپنے عالمگیر شہرت رکھنے والے عشّاق یا اپنے پروڈیوسر یا ڈائریکٹر سے گفتگو کر رہی ہے مجھے بے حد رنج ہوا۔ بڑی خجالت محسوس ہوئی۔"

" فون ختم کرنے کے بعد وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔"

" تم کپڑے پہنو — میں باہر بیٹھتی ہوں" میں نے کہا اور باہر آگئی۔ راحت ایک بڑی سی تولیہ لپیٹ کر کمرے میں آئی۔ کپڑے پہنے اور سنگھار میز کے سامنے بیٹھ کر بال سنوارنے لگی۔

" جب میں اور غیاث ہنی مون کے لئے ساؤتھ آف فرانس گئے تھے۔ وہاں ایک اسپیشل فوٹو گرافر نے یہ تصویر کھینچی تھی۔ اس نے پورٹریٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔"

" ساؤتھ آف فرانس ـــــ" عطر کی پھوار اپنی گردن پر ڈالتے ہوئے اس نے آہ بھری۔ کس قدر حسین جگہ ہے۔

" حالانکہ اس وقت میں راحت کے متعلق زیادہ نہیں جانتی تھی۔ مگر نجانے کیوں۔ مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے نہ صرف یہ بلکہ وہ طرح طرح کے دل خوش کن جھوٹ بولنے کی بے حد شوقین اور عادی ہے آخر کیوں ـــــ؟ ذرا کمینے پن سے میں نے دریافت کیا ـــــ" یورپ میں کہاں کہاں گئیں ـــــ؟"

" سارے میں گھومے ـــــ" اس نے مبہم مختاط اور مغموظ جواب دیا۔ افوہ ـــــ میڈی ٹیرنین کی لہریں کس قدر نیلی ہیں۔ میں تو ریویرا کے ساحل پر سنہری دھوپ میں لیٹی بس سمندر کا نظارہ کیا کرتی تھی۔

" اتنے میں ایک موٹا سا غیر ملکی بغیوستک دیئے کمرے میں آگیا۔ ہر سگفرڈ فان باخ ـــــ راحت نے ملوایا۔ جرمن صوفے پر بیٹھ گیا اور پسینہ خشک کرنے کے بعد راحت سے پوچھنے لگا کہ اسے یہ کمرہ پسند آیا۔ اور روم سروس کیسی ہے۔ اب وہ تیار ہو کر جرمن کے ساتھ نیچے بال روم میں جانے والی تھی۔ میں دونوں کو خدا حافظ کر کے باہر آ گئی۔

" سال نو کی شام کو وہ اسی جرمن کے ساتھ ڈھاکہ کلب میں نظر آئی اور لپک کر میرے پاس پہنچی۔ بڑی آپا نے ذرا سرد مہری کا اظہار کیا۔ آپا کے

اس رویے کو اس نے بڑی خوبصورتی سے نظر انداز کر دیا اور ان سے مزید خلوص کے ساتھ ملی۔"

"ڈھاکہ میں اس نے سب ملنے والوں پہ یہ ظاہر کیا تھا کہ میری بہت پرانی اور گہری دوست ہے۔ بڑی آپا اس سے بہت سٹ پٹا گئی تھیں۔ راحت نے لوگوں سے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ بڑی آپا اور بھائی جان سے اس کے خاندانی مراسم ہیں۔"

"یہ کیا واہیات بات ہے" آپا نے کہا ___ ارسلان احمد کے گھر والے قدامت پسند لوگ ہیں۔ وہ تمہارے متعلق کیا سوچیں گے کہ تم راحت کا شانی کی دوست ہو۔

"مگر آپا۔ ذرا سوچئے تو ___ اس غریب نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ اچھی خاصی معقول لڑکی ہے۔"

"معقول لڑکی ہے ___ معقول ___" آپا نے بڑے الم سے کہا۔

"لیکن میں جانتی تھی کہ راحت اپنے آپ کو بے حد غیر محفوظ محسوس کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح خود کو ایسے لوگوں سے مماثل کرے۔ جن کے قدم زندگی میں مضبوطی سے جمے ہیں۔

" صنوبر ہماری پڑوسی تھی۔ مگر راحت اس سے کبھی نہیں ملی۔ ابھی راحت شاہ باغ ہوٹل ہی میں قیام پذیر تھی کہ ایک شام صنوبر گھبرائی ہوئی آپا کے پاس آئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "

" اے ہے۔ خیر تو ہے۔ کچھ منہ سے تو بول بچی ـــــ " آپا نے گھبرا کر کہا " تم جانتی ہو آپا ان پتی ورتا عورتوں میں سے ہیں۔ جن کا خیال ہے کہ اگر شوہر شرابی۔ بدمعاش یا جرائم پیشہ بھی ہو تب بھی بیوی کو مرتے دم تک اس کے ساتھ نباہ کرنا چاہیئے۔ آپا ڈولا آئے اور جنازہ نکلنے والے مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتی ہیں (اور صد افسوس کہ یہ مدرسۂ فکر اب تیزی سے معدوم ہوتا جا رہا ہے) چنانچہ وہ اصولی طور پر صنوبر کی اس حرکت کو ناپسند کرتی تھیں۔ کہ وہ اپنا شوہر اور بچہ چھوڑ کر دوسرے آدمی کے گھر آ گئی۔ مگر بہر حال صنوبر ایک بڑی خاموش، شریف طبیعت گھریلو سی لڑکی تھی۔ اسی لئے آپا کو اس سے

اُنس بھی بہت تھا۔

"صنوبر نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا" وہ چڑیل ـــــ وہ ـــــ وہ ڈائن ـــــ وہ یہاں بھی آن پہنچی ہے۔"

"کون بھئی ـــــ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"فرحت ـــــ اور کون ـــــ قاسم ایک ہفتے سے گھر سے غائب ہے۔ مجھ سے کہہ کر گیا تھا کہ دورے پر شمالی بنگال جا رہا ہے اور ابھی ابھی واجد نے آ کر بتایا کہ جے وبے پور کے راستے میں لانچ پر جشن ہو رہے ہیں۔"

"مجھے دفعتاً یاد آیا۔ ان ہی آبی راستوں اور ان ہی جہازوں پر صنوبر قاسم سے چوری چھپے ملا کرتی تھی اور شمشاد غم و غصے اور بےبسی کے عالم میں پیچ و تاب کھاتا رہتا تھا۔

"آپا نے آہستہ سے کہا، بٹیا، جس مرد کے ہاتھ میں تمہارے باپ نے تمہارا ہاتھ دیا۔ اسے تو تم بلا قصور ٹھکرا کر چلی آئیں۔ کیا قاسم سے بیاہ کرتے وقت تم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ دراصل کس قسم کا انسان ہے ـــــ؟ خود کردہ را علاج نیست بی بی۔ اب صبر کرو۔

"آپا ـــــ میں نے کوفت کے ساتھ کہا، صنوبر اور زیادہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔"

"مجھے تو تمہاری یہ صنوبر کچھ بے وقوف سی دکھتی ہے،" آپا نے

رنجیدہ آواز میں اظہارِ خیال کیا۔

" اسی وقت برآمدے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دیکھا کہ واجد سامنے کھڑا ہے۔"

" یہ کیا باؤلا پن ہے۔ چلو گھر چل کر منہ ہاتھ دھوؤ۔ بچیاں تم کو یاد کر رہی ہیں۔ اس نے کہا۔

" صنوبر نے ذبح ہوتی ہوئی بھیڑ کی طرح نظریں اُٹھا کر واجد کو دیکھا واجد نے بڑی دلسوزی اور دردمندی کے ساتھ سہارا دے کر اسے کرسی سے اُٹھایا اور بچوں کی طرح سنبھالتا اور دلاسے دیتا اسے ہمارے احاطے سے باہر لے گیا۔

" آپا نے مغرب کی نماز کے لئے کرسی پر سے اُٹھتے ہوئے گہرا سانس بھر کر کہا۔۔۔ اللہ۔۔۔ تیری دنیا میں کیسے کیسے تماشے ہوتے ہیں۔"

" ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک شام میں باہر گھاس پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی کہ صنوبر نے مہندی کی باڑ پر سے اُچک کر مجھے دیکھا اور پھر چاروں طرف نظر ڈال کر دوڑتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ اس کا چہرہ سپید ہو رہا تھا۔ قریب کی کرسی پر وہ اس طرح بیٹھی جیسے بہت بوڑھے، خستہ جان تھکے ہارے لوگ بیٹھتے ہیں۔"

" زرینہ۔۔۔" اس نے آہستہ سے کہا " بتاؤ میں اب کیا کروں؟"

" قاسم صاحب واپس آ گئے۔۔۔؟"

"ہاں ــــ مگر وہ کہتے ہیں کہ محبت ـــــ مر چکی ہے۔ محبت مر چکی ہے۔ سنا تم نے زرینہ ـــــ؟ اس نے جھک کر گھاس کی چند پتیاں اکھیڑیں۔ پھر انہیں بکھیر دیا۔ محبت جسے ابدی، اور زندہ جاوید کہا جاتا ہے۔ شیلانگ میں، اس نے مشرق کے گلزنگ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے کیا کیا کچھ مجھ سے کہا تھا۔ کیسے کیسے وعدے کئے تھے اور اب ـــــ اب ان سارے لطیف احساسات کا، سارے خوابوں کا، اس ازلی اور ابدی محبت کا جنازہ نکل گیا ـــــ زرینہ ـــــ"

"میں خاموش رہی بس اس سے کیا کہہ سکتی تھی۔ درختوں میں ایک پپیہا زور زور سے بول رہا تھا۔ آم کے جھنڈ میں کوئل کوک رہی تھی۔ ارے پپیہا یا درے آدھی رات جن کوک۔ دھیرے دھیرے سلگتی سوہ تو نے دبی پھونک ـــــ مجھے جھرجھری سی آئی۔ اور میں نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"دفعتاً سفید غرارے قمیص میں ملبوس، سفید دوپٹے سے سر ڈھانپے آپا کی جھلک نیم تاریک برآمدے میں نظر آئی۔ انہوں نے آواز دی، صنوبر۔ دونوں وقت مل رہے ہیں، سر ڈھکو اور اللہ سے دعا مانگو۔ وہ اندھیرے میں غائب ہو گئیں۔ گھمن گھیری شام کا سناٹا ڈراؤنا ہو گیا۔

"زرینہ ـــــ صنوبر مدھم لیکن مضبوط آواز میں کہہ رہی تھی۔ تمہارا خیال ہے مجھے مر جانا چاہیئے ـــــ؟ کیونکہ میں محبت تھی۔"

« بکواس مت کرو ــــ » میں نے غیر یقینی لہجے میں جواب دیا۔

« زرینہ ــــ وہ کہتا ہے کہ فرحت اس کے لئے مکمل عورت ہے۔ برسوں پہلے ــــ کلکتے میں وہ اس کی مکمل عورت کی حیثیت سے اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی اور اب جب وہ اسے دوبارہ مل گئی ہے۔ تو وہ اسے پہلے کی مانند ترک نہیں کر سکتا۔ »

« پھر اس نے تمہارا گھر برباد کر کے تم سے شادی کیوں کی تھی۔ ؟ » تم نے یہ نہیں پوچھا ــــ

« وہ کہتا ہے کہ وہ وقت کی بات تھی۔ » وہ تلخی سے ہنسی ــــ وقت کی بات! زرینہ اس وقت میں دوسرے کے کھیت ــــ گائے ــــ نہیں ــــ گھاس ــــ تھی ــــ جو ہمیشہ دور سے زیادہ ہری نظر آتی ہے ــــ وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

« مگر فرحت یہاں آئی کس طرح ہے ــــ ؟ »

« اس کا میاں سروپ کمار اپنی نئی لیڈنگ لیڈی سے عشق کرنے میں مصروف ہے اور دونوں میاں بیوی کو ایک دوسرے کی زیادہ پرواہ نہیں رہی۔ مگر یہ عورت بے حد سمجھدار ہے۔ اس نے وہ سارا روپیہ جو اسے سروپ کمار نے دیا تھا « بیک ڈور » سے یہاں منتقل کروالیا ہے۔ اور ــــ اور ــــ اللہ ــــ یہ سب کس قدر خوفناک گھٹیا باتیں ہیں۔ دنیا اتنی گھٹیا کیوں ہے

زرینہ ــــ ؟

" اس سوال کا جواب تو بڑے بڑے فلسفی اور پیغمبر بھی نہیں دے سکے"
بس نے ذرا اکتا کر جواب دیا۔ قاسم کو رتی بھر احساس نہیں کہ مجھ پر کیا گذری ہے۔
زرینہ ــــ انسانی جسم کی موت ایک کیمیکل ایکشن ہے۔ کیا عبث کی موت
بھی ایک کیمیکل ایکشن ہے۔

" ہاں ــــ انسان میں کیمیکل تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح جذبات
بھی بدل جاتے ہیں۔"

" اب فرحت اور قاسم بالکل یک جان اور دو قالب ہیں" بتاؤ میں
کیا کروں ــــ ؟

" اگر واقعی ایسا ہے تو تم کچھ نہیں کر سکتیں صنوبر تم ایک مرد اور ایک
عورت کے مابین ان کے خالص ذاتی، جذباتی معاملات میں دخل انداز نہیں
ہو سکتیں۔"

" ایک مرد ــــ ایک مرد ــــ ؟" اس نے انتہائی کرب سے دہرایا۔
وہ میرا شوہر ہے زرینہ ــــ

" آسمان پہ بادل اُمنڈ کر گھر آئے" بارش آنے والی ہے صنوبر اب
گھر جاؤ ــــ بس نے کہا۔

" میرا گھر ــــ کہاں ہے ــــ ؟"

"آخر قاسم صاحب تم سے کہتے کیا ہیں ___؟"

"کچھ نہیں ___ وہ بات ہی نہیں کرتے۔ آج انہوں نے صرف اتنا کہا کہ اب ہم دونوں کا اکٹھا رہنا ہم دونوں کی ایک دوسرے کے ساتھ بےانصافی ہوگی۔ بس ___ میں کل ارمنی ٹولہ میں ایک بزرگ کے یہاں بھی گئی تھی۔ اس نے نیچی آواز میں کہا۔ انہوں نے ایک نقش دیا ہے۔"

"میں آنکھیں پھاڑ کر صنوبر کو دیکھنے لگی، اس نے اپنے براؤن بال جھٹک کر اور نیلی آنکھیں سچ سچ کا کر مجھے ملتجیانہ، پُرامید نظروں سے دیکھا ___ بتاؤ ___ اس کا کوئی فائدہ ہوگا ___ ؟ مگر آج دوپہر وہ بیڑا یا واجد کے ہاتھ لگ گئی۔ انہوں نے اسے پھاڑ کر رکھ دیا اور مجھے خوب ڈانٹا۔ مگر میں شاہ صاحب سے دوسرا نقش لا سکتی ہوں۔"

"بادل گرجنے لگے۔ پپیہے کی پی کہاں، تیز ہوگئی۔ صنوبر، میں نے مضبوطی سے کہا۔ گھر جاؤ ___"

"یہ عورت ___ یہ عورت ___ کیا اسے بمبئی میں عشاق کی کمی تھی۔ یہ میرا گھر برباد کرنے کیوں آگئی ___ ؟" اللہ کے یہاں کوئی انصاف نہیں۔

وہ بلک بلک کر رونے لگی اور اُٹھ کر بھاگتی ہوتی اپنی کوٹھی کی طرف چلی گئی

"صبح کو آپا کی ملازمہ نے بتایا کہ برابر والی بیگم صاحب کہیں باہر جا رہی ہیں۔

واجد صاحب کی کار پر سامان لد رہا ہے،،

،،کوئی گیارہ بجے کے قریب واجد نے مجھے فون کیا۔ وہ ایئر پورٹ سے بول رہا تھا۔ اس نے کہا صنوبر کا نروس بریک ڈاؤن ہو رہا ہے۔ بس اسے تبدیل آب و ہوا کے لئے اپنے ساتھ کاکس بازار لے جا رہا ہوں۔ قاسم کل رات ایک ماہ کے لئے پھر دورے پر چلا گیا ہے۔ اگر وہ واپس آکر تم سے صنوبر کے متعلق دریافت کرے تو اسے بتا دینا کہ صنوبر اب میری ذمے داری ہے۔ خدا حافظ۔

،، لیکن قاسم سے ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ اسی رات لکھنؤ سے تار آیا کہ ابا میاں سخت بیمار ہیں۔ بیں اور آپا بدحواس ہو کر تیسرے دن لکھنؤ روانہ ہو گئے ایک ڈیڑھ مہینے میں ابا میاں اچھے ہوتے تو ڈھاکے سے ارسلان کی والدہ نے تقریباً روزانہ ٹرنک کال شروع کر دیئے کہ کم از کم منگنی کی رسم باقاعدہ ادا ہو جانی اشد ضروری ہے۔ اُن کو ڈر تھا کہ بیں شاید رسی تڑا کر بھاگ نکلی ہوں اور اب لکھنؤ سے ڈھاکے واپس جانے پر تیار نہ ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ ابا میاں کی بیماری اور صنوبر وغیرہ کی انتہائی کنفیوزڈ اوز بے تکی زندگیوں کا مرقع دیکھنے کے بعد بھیا میں نے ہڑبڑا کر ہاں کر دی (اور اللہ کا شکر ہے کہ اپنے اس فیصلے سے بے حد بے حد خوش ہوں)

،، چنانچہ میں آپا کے ساتھ ڈھاکے لوٹ آئی۔ ارسلان احمد کے ساتھ باضابطہ منگنی کی رسم ادا ہوئی اور شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔،،

« ارسلان احمد کی سب سے بڑی بہن جہاں آرا آپا کے میاں بھی اسٹیم کمپنی میں ملازم ہیں۔ انہوں نے مجھے آپا اور بھائی جان کو اپنے یہاں فنچو گنج مدعو کیا ہے۔ میرے سسرال والے بڑے سیدھے سادے اور نیک طینت لوگ ہیں اور بے حد خوش باش۔ پروگرام یہ تھا کہ جہاں آرا آپا کے یہاں تین چار روز تک ملوس پارٹی منائی جائے گی۔ وہاں ارسلان کی ساری بہنیں بہنوئی بھائی اور بھاوجیں جمع ہونے والے تھے اور بھیا میر انوروس نس کے مارے بڑا حال۔ مگر خیر۔

« تو ہم سب تمہاری پسندیدہ جگہ فنچو گنج پہنچے۔ واقعی بڑا افسانوی ماحول تھا۔ دور دور تک بکھرے ہوتے لکڑی کے بنگلے۔ دریا کے کنارے کنارے بنے ہوتے پگوڈا ایسے مکان اور بقول تمہارے سخت چینی اور برمی قسم کی فضائیں۔

« صبح کو سارا قبیلہ ناشتے کی میز پر بیٹھا تھا اور بڑا غل مچ رہا تھا کہ جہاں آرا آپا کی لاڈلی ٹین ایج لڑکی تمکس آرا بھاگتی ہوئی اندر آئی اور بولی۔ امی — پندرہ نمبر میں انڈیا سے "مرزا غالب" کے ریکارڈ آتے ہیں چلئے جلدی سے چل کر ان کو ٹیپ کر لیں۔ چلئے — اُٹھیے — اور جھٹک کر ان کی سرخ کنارے والی سفید ساری کا آنچل گھسیٹنے لگی۔

« اے ہے بچی —» جہاں آرا آپا نے اس سے کہا۔ تمہاری نئی ممانی دلہن تمہارے لئے ہندوستان سے ڈھیروں ریکارڈ لے آئیں گی۔ ایسی گھبراہٹ

کیا ہے۔

"میں شرم سے سُرخ ہو گئی اور ہڑبڑا کر دولہا بھائی یعنی جہاں آرا آپا کے شوہر سے دریافت کیا۔ پندرہ نمبر میں کون رہتا ہے ۔۔۔؟"

"قاسم علوی ۔۔۔" انہوں نے مختصر جواب دیا۔ میں چپکی ہو رہی۔

"نہیں ۔۔۔ ہم تو تنزیا کے گانے ابھی ٹیپ کریں گے۔ قاسم صاحب کل شاید چلے جائیں۔ شمس آرا نے ضد جاری رکھی۔"

"چنانچہ دولہا بھائی نے قاسم کو ٹیلی فون کیا کہ رات کے کھانے کے ہم سب کے یہاں دھاوا بولیں گے۔"

"بی بی ۔۔۔ وہ رات بڑی عجیب سی تھی۔ نہ جانے کیوں میرا دل دھڑک رہا تھا مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے میں صنوبر کے ساتھ غداری کر رہی ہوں ارسلان مجھ سے بار بار پوچھتے کہ تم خاموش کیوں ہو۔ مگر میں کوئی جواب نہ دیتی۔ کھانے کے بعد ٹیپ ریکارڈر سنبھال کر شمس آرا سب سے پہلے اسٹیشن ویگن میں جا بیٹھی اور سارا کنبہ جیپ اور اسٹیشن ویگن میں لد کر "پندرہ نمبر" پہنچا۔

"بے حد طویل و عریض جگمگاتی لکڑی کے بنگلے پر خاموشی طاری تھی۔ ہم لوگ برآمدے اور گیلری عبور کر کے اندر گئے۔ جہاں ایک بے انتہا وسیع ڈرائنگ روم کے آتشدان میں آگ جل رہی تھی۔"

"چند منٹ بعد قاسم اور فرحت مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ میں چونک اٹھی۔ بالکل اسی انداز سے قاسم صنوبر کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالے مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا تھا۔"

"فرحت مجھے دیکھ کر بڑے تپاک سے میرے پاس آئی۔ میں ڈھاکے اس سے کتنی بار راحت کے ساتھ مل چکی تھی۔"

"راحت کہاں ہیں آج کل ــــ"، میں نے کھوکھلی آواز میں سوال کیا۔

"بمبئی گئی ہے۔ لیکن اس کی شادی ہونے والی ہے۔"

"اچھا ـــ ہر سگفرڈ نان باخ سے؟"

"ارے نہیں ــــ ایک بے حد سویٹ کینیڈین ہے۔ چارلس فریزروہ راحت کو بہت دن سے کورٹ کر رہا تھا۔ مگر وہ نہیں مانتی تھی کیونکہ وطن چھوڑ کر سات سمندر پار جا لبنا کیا تک ہے۔ پھر اس نے مہمانوں کی خاطر مدارات شروع کی۔ وسیع اونچی چھت والا کمرہ باتوں کے شور سے گونج رہا تھا۔ پھر شمس آرا نے ثریا کے تازہ ترین ریکارڈ جو فرحت بمبئی سے لائی تھی۔ ریڈیو پروگرام پر لگائے اور ان کو ٹیپ کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد میرے پیارے بنگالی سسرال والوں نے بنگالی گیت گائے غرضیکہ بڑی تفریح رہی بقول شخصے۔"

"چلتے وقت دولہا بھائی نے فرحت سے کہا۔ شب بخیر، بیگم قاسم۔

”اس نے اطمینان سے جواب دیا ـــــ میں مسز سروپ کمار ہوں آپ کی تشریف آوری کا دلی شکریہ ـــــ اور مسکرا کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

” ہماری بڑی آپا اور بھائی جان کی طرح بھائی بھی پرانی اقدار کے آدمی ہیں۔ بے چارے کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور جھینپ کر نظریں نیچے کئے سکتے آگے بڑھ گئے۔“

”بی بی، جس وقت ہم سب اس وسیع گہرے کمرے میں بیٹھے تھے اور ثریا کی آواز ع کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے، کی تکرار کر رہی تھی ـــــ تب دفعتاً ایسا ہوا ـــــ آوازوں کے باوجود سناٹا چھا گیا۔ اور ایسا لگا جیسے وجود کی ساری امٹ پشیمانی اور لغویت اور خستگی اور بے معنی پن اور بے رحمی دریا پہ بھرے کہرے کے ریلے کے ساتھ کمرے میں گھس آئی ہے اور ایسا لگا جیسے ـــــ جیسے وقت سُن رہا ہے ـــــ میں ـــــ میں وضاحت نہیں کر سکتی کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔ مگر تم سمجھ گئیں نا ـــــ؟“

دور جنگلوں میں گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر زرینہ کو دیکھا۔" سرحد یہاں سے بہت قریب ہے۔ اس نے تیوری پر بل ڈال کر سر جھکاتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ اور پھر کہانی شروع کر دی۔

شادی کے بعد میں اور ارسلان ایک شام ڈھاکہ کلب میں بیٹھے تھے۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ کپلنگ کی قوم سے ترکے میں حاصل کیا ہوا یہ انیسویں صدی کا برطانوی اپر کلاس انسٹی ٹیوشن برّصغیر کے بڑے شہروں میں پرانی اسنوب ویلیو رکھنے کے علاوہ نئے دولت مند طبقے کی ایسی چوپال بن چکا ہے۔ جہاں سیاست ہائی فنانس اور دل کے سودے کس دھڑلے سے ہوتے ہیں۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ راحت ایر فورس کے افسروں کے جمگھٹے میں کھڑی چہک رہی ہے۔ مگر وہ بارہ تیرہ برس قبل والی راحت تھی۔ جسے میں نے کلکتے میں دیکھا تھا۔

"مس عصمت کا ثانی" کوئی کہہ رہا تھا۔

"عصمت بی بی بے چاری" کسی اور نے زیر لب کہا۔

"میں نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ ایک ونگ کمانڈر نے تعارف کروایا عصمت کاشانی۔ ابھی کوئٹے سے بی۔ اے کر کے آئی ہیں۔ راحت اور فرحت کی چھوٹی بہن عصمت نے بڑی تمکنت وغرور سے سلام کیا۔ اس میں راحت اور فرحت جیسی ملنساری اور اخلاق نہیں تھا۔ اسے ان صفات کی شدید ضرورت بھی نہیں تھی، کیونکہ وہ بے پناہ حسن کی مالک تھی جو زندگی میں اس کی کامیابی کا ضامن تھا۔ میں نے ایک لحظے کے لئے پھر ان عجیب وغریب بہنوں کے پرُاسرار پس منظر کا تصور کیا۔ خانہ بدوشوں کے کارواں۔ سرد چشمے، سیب اور بادام کے جھنڈ"

"اسی وقت فرحت بھی آگئی اس گروہ میں شامل ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد میں اور ارسلان وہاں سے کھسک آئے۔

"ارسلان کا تبادلہ سلہٹ کا ہوگیا۔ اور یہاں جانتی ہو ہماری ملاقات جب ہم اس بنگلے میں آئے۔ تو سب سے پہلے کس سے ہوئی ۔۔۔؟"

"مسٹر اور مسز واجد ۔۔۔!"

"ان کے یہاں ایک لڑکا بھی ہے۔ صنوبر کی ممی حسب معمول شیلانگ سے چند مہینے کے لئے بیٹی داماد کے پاس آجاتی ہیں۔ صنوبر اور واجد کبھی بھولے سے بھی اپنے ماضی کا ذکر نہیں کرتے۔ تم کو شاید یاد ہو کہ واجد وہ شخص ہے۔ جو کلکتے میں راحت کاشانی کا اولین اور غالباً پہلا عاشق تھا۔ جب وہ وار

پبلسٹی کے محکمے میں کام کر رہی تھی اور اس کے ساتھ رہتی تھی۔ مگر واجد نے اس سے شادی نہیں کی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اس کی عزت نہیں کرتا۔ یاد ہے نا۔۔؟"

"ہاں ـــــ"

"اور میں سمجھتی ہوں ـــــ" رزرینہ نے گلا صاف کر کے کہا ـــــ "کہ یہ دونوں یعنی صنوبر اور واجد، اپنی زندگی سے میرا مطلب ہے کہ کافی مطمئن ہیں۔

"کوئی چار مہینے کی بات ہے۔ میں ڈھاکہ گئی ہوئی تھی وہاں اب ریسٹورنٹ اور نائٹ کلب کھل گئے ہیں۔ اور ڈھاکہ وہ پہلا سا خوابیدہ، پُرفسوں شہر نہیں رہا۔ بہر حال، تو وہاں ایک دکان سے نکل رہی تھی کہ کیا دیکھتی ہوں کہ قصبہ ریسٹورا کے سامنے ایک چمکدار تھنڈر برڈ کھڑی ہے۔ جس کا ہُڈ اترا ہوا ہے اور پچھلی سیٹ پر فرحت اور کاشانی نوابزادیوں کے سے انداز میں بڑے ٹھسے سے بیٹھی ہیں۔ قصبہ ویٹر چار کی کشتی پیش کر رہا ہے اور چند حضرات کار سے لگے ہوئے کھڑے دونوں حسیناؤں سے باتوں میں مصروف ہیں۔

"جگہ کی تنگی کی وجہ سے مجھے اُن کی کار سے بالکل سٹ کر نکلنا پڑا تو فرحت نے خاصی بے اعتنائی سے کہا۔

"ہلو زرینہ ـــــ"

"ہلو ـــــ ہلو ـــــ" میں نے ٹھٹھک کر اس کی خیریت دریافت کی اور

پوچھا کہ قاسم صاحب کیسے ہیں (کیونکہ میں نے سنا تھا کہ قاسم نے صنوبر کو طلاق دینے کے بعد فرحت سے، جو سروپ کمار سے طلاق لے چکی ہے۔ باقاعدہ شادی کرلی ہے) تس پر فرحت نے انتہائی سرد مہری سے جواب دیا۔ مجھے معلوم نہیں۔

"یقین جانو میں بیحد قائل ہوئی۔ اور اپنی بیوقوفی کا کامل یقین ہوگیا۔ جب میں تیزی سے سڑک عبور کر کے اپنی کار کی طرف بڑھ رہی تھی تو قصبہ میں سے نکلنے والے دو نوجوانوں کے دو فقرے میرے کان میں پڑے:۔

"سونا کھودنے والیاں" اور "پبلک سیکٹر!"

"اور تب دفعتاً مجھ پر انکشاف ہوا۔ تمہارا اور میرا محبوب، خوابیدہ، مرنجاں مرنج، سیدھا سادا، غریب، شریف، بھولا بھالا، پروفنشل ڈھاکہ اب ایک ماڈرن، صنعتی، سوفیسٹی کیٹیڈ SOPHISTICATED بڑا شہر بن چکا ہے اور اس حیرت انگیز قلب ماہیت کی ایک علامت، یہ چکیلی تھنڈربرڈ بھی ہے جو قصبہ ریسٹوران کے سامنے کھڑی ہے۔ لیکن ——" اس نے توقف کے بعد کہا۔ "ملک کی اس خوش آئند ترقی کے ساتھ یہ تناخسانے ناگزیر ہیں۔ ہمیں اس چمکدار تھنڈربرڈ کو بھی غالباً قبول کرنا ہوگا۔"

شہرزاد کی پرچھائیں ساکت ہوگئیں۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ آتشدان کے شعلے مدھم پڑ گئے۔ کمرے میں اب صرف دیوار پر لگا ہوا الیکٹرک کلاک روشن تھا میں نے نظریں اُٹھا کر اسے دیکھا۔ کلاک کا روشن چہرہ جو صرف وقت بتاتا رہتا ہے۔

بے رحمی، بے تعلقی، بے نیازی کے ساتھ اس کو ذرّہ بھر پرواہ نہیں کہ سارے وقت تم پر کیا بیت رہی ہے؟

"چنانچہ بی بی ـــ" میں نے کچھ دیر بعد کہا ـــ "یہ تمہارے ہاں کی زندگی ہے"

"ہاں ـــ مگر ایک قسم کی زندگی اور بھی ہے۔" شہرزاد کی پرچھائیں نے کہا۔

"جس کو میں اس سرزمین پر سارے میں کھوجتی پھرتی ہوں۔ وہ چاروں طرف بکھری نظر آجاتی ہے۔ جس کو میں لکھے ہوئے الفاظ اور سلولائیڈ کی ریل کی گرفت میں لانا چاہتی ہوں، مگر وہ زندگی اتنی زخمی، اتنی گمبھیر، اتنی وسیع و عظیم ہے۔"

"ـــ کہ اس کی عکاسی اور ترجمانی کے لئے دل و جگر کا خون کرنا ہوگا ـــ"

شہرزاد کی پرچھائیں نے میری بات کاٹی ـــ پھر بھی کامیابی مشکل ہے۔ یہ میرا قلم" میں نے اسکرپٹ پر رکھے ہوئے فاؤنٹن پن کو تاسف سے دیکھا۔

"کتنا کمزور اور ناکافی اور بے معنی اور مجبور ہے۔"

اچانک سامنے کے برآمدے میں بندھے ہوئے السیشن نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔

"ٹھہرو ـــ میں دیکھتی ہوں۔" میں نے قریب کے فلور لیمپ کا سوئچ دبایا شہرزاد کی پرچھائیں غائب ہوگئی۔ زرینہ کمرے کی لمبائی عبور کر کے دریچے میں گئی۔ میں نے اس کے پیچھے پیچھے جا کر دریچے کا پردہ سرکایا اور باہر جھانکا جھلملاتے عنابی فرش والے چوڑے برآمدے کے ایک ستون کے پیچھے کتا بے تحاشا چلا

رہا تھا۔

سامنے پھیکی چاندنی میں دو سائے گھاس پر سے گذرتے آہستہ آہستہ بنگلے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک لمحے کے لئے میں اور زرینہ سہم کر رہ گئے۔ ارسلان بھائی آنکھیں ملتے اپنے کمرے سے نکل کر ڈرائینگ روم میں آئے اور جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ پرچھائیاں سیڑھیوں پر آ کر سرنگوں بیٹھ گئیں۔

ارسلان بھائی نے ڈپٹ کر کتے کو چپ کرایا۔ سیڑھی پر خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ زرینہ نے مجھے آواز دی۔

"میڈیکل بیگ —— جلدی —— میرے کمرے کی کھڑکی میں۔" میں نے برآمدے کی روشنی جلائی اور سائے ایک مرد اور ایک عورت میں تبدیل ہو گئے بھورے رنگ کی شکستہ لوئی میں لپٹا ہوا نوجوان تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ لڑکی جس نے گھونگھٹ میں چہرہ چھپا رکھا تھا۔ ارسلان بھائی کو دیکھ کر بام کے گلے کے پیچھے دبک گئی۔ ارسلان بھائی نے جھک کر اجنبی نوجوان کو غور سے دیکھا اور دفعتاً سوال کیا "کہاں سے آئے ہو ——؟"

وہ خاموش رہا اور دہشت زدہ نظروں سے ارسلان بھائی کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے بیحد سہم کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے زرینہ کا میڈیکل بیگ لا کر دیا بنگلے کا چوکیدار کھٹ کھٹ ڈنڈا بجاتا باغ کے اندھیرے میں سے نمودار ہوا۔ زرینہ نے نوجوان کی ٹانگ کا معائنہ کیا۔ "شکر ہے گولی نہیں لگی۔ چوٹ کسی اور وجہ سے آئی ہے

زرینہ نے کہا پھر اس نے لڑکی کو مخاطب کیا۔ "لو اپنے آدمی کو ادھر لٹا دیا ـــــ"، شاگرد پیشے کی طرف سے دو تین ملازم دوڑتے ہوئے آن پہنچے۔ لڑکی نے گھبرا کر چہرہ اچھی طرح چھپا لیا۔ "اگر تم اس طرح منہ چھپائے رکھو گی تو کیسے کام چلے گا۔ لو ادھر سے اس کی ٹانگ پکڑ لو ـــ ذرا شاباش ـــ"۔

زرینہ مرہم پٹی میں مصروف ہو گئی۔ لڑکی نے ڈرتے ڈرتے پہلی بار بات کی۔

"ای یع جینین بیگم صاحب ـــ؟"

زرینہ نے چونک کر اسے دیکھا ـــ "پاربتی ـــ!!؟"

پاربتی نے آگے کھسک کر زرینہ کے پاؤں پکڑنا چاہے۔

"گڈ گاڈ ـــ وی آر ان فار ٹربل ـــ" زرینہ نے پیچھے ہٹ کر انجکشن کی سرنج بھرتے ہوئے کہا۔

ارسلان بھائی نے سگریٹ سلگایا اور ڈریسنگ گاؤن پہنے پہنے سیڑھیاں پھلانگ کر جیپ میں جا بیٹھے ـــ "زرینہ یہ بارڈر ان سی ڈنٹ ہے۔ احتیاط سے کام لو میں تحقیقات کے لئے جاتا ہوں ـــ" دوسرے لمحے جیپ ٹیلے کی ڈھلوان اتر کر اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ چند منٹ بعد احاطے کا دوسرا پھاٹک ہیڈ لیمپوں کی روشنی سے جگمگا اٹھا۔ پولیس جیپ زناٹے سے آ کر رکی۔ سب انسپکٹر نے اتر کر زرینہ کو سیلوٹ کیا اور غیر قانونی طور پر ملک میں داخل ہونے والے بھارتی مسلمان مسمی غفورالرحمٰن میاں کو حوالۂ پولیس کرنے کا مطالبہ کیا۔

"صاحب ابھی باڈر پر گئے ہیں۔ اُن کے آنے کا انتظار کیجئے۔" زرینہ نے جواب دیا۔

اجنبی نیم بیہوشی کے عالم میں بڑبڑایا۔ سپاہی اور کانسٹیبل جیپ سے اُتر کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔

سب انسپکٹر نے آگے بڑھ کر دوسرا سوال کیا۔ "بیگم صاحبہ ۔۔۔ رام پرشاد ہیڈ چوکیدار کی لڑکی یہاں آئی ہے ۔۔۔؟ یہ اغوا کا کیس بھی ہے بیگم صاحبہ ۔۔۔"

پاربتی نے مڑ کر زرینہ کی ساری کا پلو پکڑ لیا اور اس کے پیچھے چھپ گئی۔

"تھانیدار صاحب ۔۔۔" زرینہ نے بھویں اٹھا کر پوچھا۔ "اگر یہ شخص اس ملک کا باشندہ نہیں ہے تو آپ اس پر اغوا کا مقدمہ کس طرح چلائیں گے ۔۔۔؟"

"خدا کے لئے زرینہ ۔۔۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"تم اپنا قانون مت چھانٹو۔ تم کو کیا معلوم قانونی پوزیشن کیا ہے ۔۔۔؟"

"بکواس ۔۔۔" زرینہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا ۔۔۔ "بہر حال ۔۔۔" اس نے سب انسپکٹر کو مخاطب کیا۔ "صاحب کا انتظار کیجئے۔"

اب پَو پھٹنے والی تھی۔ سپاہی برآمدے کے نیچے بجلی کی روشنی میں ارسلان بھائی کی واپسی کے منتظر رہے۔ اور زرینہ کے ملازموں سے باتیں کرنے لگے۔ سب انسپکٹر نے ٹہلتے ہوئے دور جا کر سگریٹ جلایا اور سگریٹ ختم کرنے کے بعد واپس آ کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ ایک ملازم نے گرم چاء لا کر زخمی کو پلائی۔ جو نیم بیہوشی کی حالت میں

بڑبڑایا ___ کیا ___ پاربتی اس کے قدموں کے نزدیک سر جھکائے بیٹھی رہی۔ زرینہ نے اس سے سارا واقعہ پوچھنے کی کوشش کی۔ مگر وہ بالکل خاموش تھی۔

سورج نکلتے نکلتے ارسلان بھائی واپس آ گئے۔

سب انسپکٹر نے ان سے آہستہ آہستہ مفصل بات کی ارسلان بھائی سر تیہوڑائے تیوری پر بل ڈالے غور سے سنتے رہے۔ پھر زخمی کو جیپ پر بٹھایا گیا چلتے وقت اس نے زرینہ کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہتا ہو۔ انسان دوست خاتون! آخر تم نے بھی میرے ساتھ دغا کی نا۔ دوسری جیپ پر پاربتی کو زبردستی بٹھلایا گیا تو وہ پچھاڑیں کھانے لگی۔ اس نے مڑ کر زرینہ کو دیکھا بھی نہیں۔ دونوں گاڑیاں پھاٹک سے باہر نکل گئیں۔

اب بنگلے کے عقب میں زرینہ کی ہری بھری وسیع سبزی باڑی میں مرغ نے اذان دی۔ ہم لوگ ڈرائنگ روم میں واپس آئے۔ بیرے نے جھلملاتی ہوئی چاندی کی کشتی میں سجے کوئین این ٹی سیٹ اور راسپوڈ چائنا میں چاء لاکر سامنے رکھی۔ سویرا ہو گیا۔ سامنے دریا کے پانی میں دھلے اجالے نے چاء کے باغ آہستہ آہستہ روشن کر دیئے۔

صبح دس بجے سری منگل سے اکرم خان کیمرہ مین کا فون آیا کہ وہ کراچی سے آگیا ہے اور ٹی گارڈن کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔

اس کے آنے کے بعد میں اور زرینہ اسے ساتھ لے کر نزدیک کی مختصر سی ایر فیلڈ پر گئے۔ جہاں مختصر سا طیارہ منتظر کھڑا تھا۔ خوش اخلاق پنجابی پائلٹ نے مسکرا کر خوش آمدید کہا۔ طیارہ اوپر اٹھا۔

بڑا شگفتہ سہانا دن تھا۔ تیز نیلے آسمان پر رنگ برنگے پرندے ہوا کی لہروں میں تیر رہے تھے۔ حدِ نظر تک سبزہ پھیلا تھا۔ نیلے پانیوں میں گھرے ناریل، سپاری اور تاڑ کے درختوں کے جزیروں پر سفید بگلے اور رچھے منڈلا رہے تھے۔ جگہ جگہ ہرے بھرے گاؤں کے جھونپڑوں پر زرد و سرخ اور کاسنی پھولوں کی بیلیں لہلہا رہی تھیں۔ جھیلوں میں سرخ کنول کھلے تھے۔ نالوں میں نیلوفر اور سوسن جگمگاتے تھے۔ ندیوں میں نوکے چل رہے تھے۔ "آخر ہم کا ہے کی لوکیشن تلاش کر رہے ہیں؟"

اکرم خاں وقتاً فوقتاً جھک کر کیمرہ چلادیتا۔ پیچدار پہاڑی راستے کے کنارے ایک سوائرلیس والی جیپ کھڑی تھی۔ کچھ فاصلے پر چند فوجی ٹہل رہے تھے "کل رات یہاں ایک معمولی ان سی ڈنٹ ہوا تھا" پائلٹ نے بشاشت سے مطلع کیا۔

اب ہم دریا کے اوپر پرواز کر رہے تھے نیچے پانی کی جگمگاتی سطح پر بھیرب بازار پاکستان سے اگرتلہ ہندوستان کی سمت مسافروں سے لدے ہوئے اسٹیمر رواں تھے۔ اگرتلہ سے بھیرب بازار کی سمت مسافروں سے لدے ہوئے اسٹیمر آرہے تھے۔

"آسام اور ایسٹ پاکستان کے درمیان معاملہ بہت گڑبڑ ہے ــــ" پائلٹ نے اظہارِ خیال کیا۔ "اتنا قانونی ٹریفک بھی خطرناک اور غیر قانونی تو ــ" اس نے بات پوری ختم کئے بغیر جنوبی سلہٹ کا رخ کیا ــ

"فنچو گنج ــــ" میں نے کہا ــ نرینہ اور میں نیچے جھانکنے لگے۔ جہاں سرخ چھتوں والے پگوڈا ایسے گھروں کے قطار دریا کے کنارے دور تک چلی گئی تھی۔ اکرم خاں نے ذرا تعجب سے پوچھا "آخر کیا رکھا ہے۔ ان بیک ورڈ جگہوں میں ــــ؟"

سلہٹ شہر کے اونچے پل پر ٹریفک کا جم غفیر چیونٹیوں کی طرح گذر رہا تھا۔ شاہ جلالؒ کی سفید درگاہ پر عقیدتمندوں کی سُست رو آمد و رفت جاری تھی۔ صحن میں کبوتروں کے جھنڈ بیٹھے تھے۔ ٹین کے مکانوں کے سامنے چٹائیاں اور بید کا

فرنیچر بنایا جارہا تھا۔ بازار میں سڑک کے کنارے سنترے کے ڈھیر لگے تھے۔

تیسرے پہر کو ہم لوگ گھر واپس پہنچے۔ کل ہم گھنے جنگلوں کے اوپر پہیلی کاپٹر میں جائیں گے

دوسری صبح ہم نے ہیلی کاپٹر کے ذریعے ایک بے انتہا خوش منظر کھاسی گاؤں تلاش کر لیا۔ افق پر کامروپ کی اُونچی پہاڑیاں تھیں۔ گاؤں کے دوسری جانب چاء باغان کے ٹیلے حدِ نظر تک پھیلے تھے۔ تیسری طرف گھنا جنگل تھا جس کے درمیان سے سرحد کی غیر مرئی لکیر گذرتی تھی۔ چاء باغان کے سب سے اُونچے ٹیلے کی چوٹی پر کسی اسکاٹش پلانٹر کا اکیلا بنگلہ دور سے نظر آرہا تھا۔

یہاں مسٹر اور مسز اینگس ڈنکن چالیس سال سے رہ رہے ہیں،" زرینہ نے مجھے بتایا۔" ذرا سوچو تو چالیس سال انسان کہاں پیدا ہوتا ہے اور کہاں جا کر اپنی زندگی گذار دیتا ہے۔ گلاسگو سے آکر اینگس اور نورا ڈنکن نے اپنا ماہ عسل اسی بنگلے میں منایا تھا۔ یہیں ان کے تین لڑکے پیدا ہوئے۔ جو جوان ہو کر پچھلی لڑائی میں مارے گئے۔

اب دونوں میاں بیوی پھر تنہا ہیں وہ کہتے ہیں کہ جب روزانہ شام کو اپنے

برآمدے کے سامنے ندی میں ڈوبتے سورج کا نظارہ کرتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ یہ ان کی زندگی کی بھی بڑی پرسکون اور خوبصورت شام ہے۔"

دوسرے روز اندھیرا پڑے میں اکرم خاں کے ساتھ شوٹنگ کے متعلق انتظامات کرنے کے لئے ارم نندن مکھیا کے گاؤں گئی تو دیکھا کہ تقریباً ساری بستی چوپال میں جمع ہے۔ نیکڑی اور باغوں سے لوٹتے ہوئے مزدور آ آ کر برگد کے نیچے اکٹھے ہو رہے تھے۔

"شاید بنیادی جمہوریت کی پنچایت ہو رہی ہے۔ ویلیج لیول پر" اکرم خاں نے اپنی معلومات کا اظہار کیا۔ چند ماہ قبل میں نے بنیادی جمہوریتوں کے متعلق ڈاکو منٹری فلم کا مسالہ جمع کرنے کے لئے صوبے کے وسطی اضلاع کے دیہات کا دورہ کیا تھا۔ مگر پوربی مزدوروں کا یہ مجمع بنگالی گاؤں کی پنچایت سے مختلف معلوم ہوتا تھا۔ میں نے چوپال کے قریب جا کر رام نندن کو آواز دی۔ وہ سر پہ انگوچھا لپیٹتا دوڑا آیا۔

"کوئی تہوار ہے رام نندن ـــــ؟" میں نے دریافت کیا۔

"آج برادری پارتی کا پھیسلہ کریہے ـــــ" اس نے متانت سے جواب دیا۔ اکرم خاں "چہرے" تلاش کرنے بستی کے اندر چلا گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا پارتی سر جھکائے آم کے نیچے بیٹھی پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کرید رہی تھی۔ اس کا باپ رام پرشاد دوسرے درخت کے نیچے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی

ماں ایک جھونپڑے کی دیوار سے لگی بین کر کر کے بیٹی کو کوسنے میں مصروف تھی۔ پاربتی کے بازوؤں پر نیل پڑے تھے۔ پاربتی کو ایسٹ مین کلر کی اس غنائی ٹوکومنٹری کا ایک اہم کردار بننے والی تھی۔

دوسری صبح میں کھاسی گاؤں کی طرف جا رہی تھی کہ جنگل کے راستے پر غفورالرحمان میاں نظر آ گیا۔ وہ سڑک کے کنارے لوٹی اور ٹے سے اکڑوں بیٹھا تھا۔ پھر وہ بڑی مشکل سے آلتی پالتی مار کے بیٹھا اور زخمی ٹانگ پھیلا کر زرینہ کی باندھی ہوئی پٹی جو میلی اور ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ بڑے دھیان سے دوبارہ کسنے لگا۔ جیپ اپنے نزدیک رکتی دیکھ کر وہ اس رات کی طرح سہما نہیں بلکہ بڑے استغنا سے مجھے گھورنے لگا۔ اتنے میں کچھ فاصلے پر ایک بادہست میں سے بارڈر پولیس کا ایک سپاہی نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ دس بارہ آدمیوں کا گروہ تھا۔ جو ایک کنبہ معلوم ہوتا تھا۔ اس میں بوڑھے، بوڑھیاں، بچے اور نوجوان سبھی شامل تھے۔ وہ سب سرحد کے پھاٹک کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ غفورالرحمان میاں ان سب سے پیچھے لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا اور اس کے عقب میں ایک اور سپاہی تھا۔

جیپ آگے بڑھی۔ راستے کے دونوں طرف سفید تیتریاں اُڑ رہی تھیں جنگل کے اندر سبز رنگ جیسے گہرے اندھیارے پر سے اکا دُکا کھاسی عورت گذر جاتی تھی۔ آسمان پر ایک ڈکوٹا گوہاٹی کی سمت سے آیا اور گڑگڑاتا ہوا کلیشر کی طرف نکل گیا۔ کیا یہ طیارہ بھی فضا میں دخل اندازی کر رہا ہے؟ انسان ایسی سرزمینوں پر

دخل اندازی کر رہے ہیں۔ جن کے لئے ان سے کہا جاتا ہے کہ ان کا کوئی حق نہیں۔
انسان ایک دوسرے کے جذبات میں، دلوں میں دخل اندازی کر رہے ہیں ——
سرحدوں کے متعلق، کون کس کا فیصلہ کرے گا؟

"اس رات والے معاملے کا عقدہ اب تک حل نہیں ہوا۔" رات کو مسٹر اور مسز میلکم مک فرسن کے یہاں کھانے کی میز پر زرینہ نے کہا۔

"غفور الرحمان میاں ـــــ" ارسلان بھائی سے چاول کی قاب سنبھیا مک فرسن کے ہاتھ سے لیتے ہوئے جواب دیا۔

"ان لاکھوں لوگوں میں سے ہے۔ جو روزی کی تلاش میں پردیس چلے جاتے ہیں۔ کلکتے میں ریور نیوی گیشن کا بیشتر عملہ سلہٹ کے ملاحوں پر مشتمل ہے۔ جن کی قومیت اب بھی پاکستانی ہے۔ غفور الرحماں میاں سلہٹی ملاح ہے اور اپنے اسٹیمر پہ آسام سے یہاں آتا رہتا تھا۔ ہمارے اسٹیمر گھاٹ پر اسے پاربتی مل گئی۔ جو ہماری فیکٹری سے برآمد ہونے والی چاء کی پیٹیاں ڈھو کر اسٹیمروں پر چڑھاتی ہے "

"پاربتی کا باپ میری اسٹیٹ پہ بھی چوکیداری کر چکا ہے۔" میلکم مک فرسن نے

سر اٹھا کر مجھے بتایا۔

"پاربتی اور غفورالرحمان میاں ـــ" ارسلان بھائی نے رائی کی شیشی اپنی جگہ پر واپس رکھتے ہوئے کہا ـــ" ایک دوسرے کو بے انتہا چاہنے لگے۔ رواج کے مطابق پاربتی کی بچپن سے کسی شخص سے سگائی ہو چکی ہے۔ جو چاند پور ربگان پر کام کرتا ہے اور اس کے باپ سے دس سال بڑا ہے۔ بہت جلد اس کا گونا بھی ہونے والا تھا۔ پاربتی نے غفور سے کہا کہ وہ اسے اپنے ساتھ آسام یا کلکتے بھگا لے جائے مگر غفورالرحمان میاں نے اس سے کہا کہ وہ اور اس کے ماں باپ اپنے آبائی گاؤں واپس آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیونکہ اس کے ماں باپ اور دوسرے گھر والوں کو پاکستانی کی حیثیت سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس نے پاربتی کو اپنے آنے کی اطلاع کرا دی اور یہ لڑکی راتوں رات اسے لینے کے لئے بارڈر پر پہنچی۔ ان کا ارادہ تھا کہ جنگلوں جنگلوں ہوتے دریا پر پہنچ کر جنوبی سلہٹ چلے جائیں گے۔ جہاں غفورالرحمان میاں کا آبائی گاؤں ہے۔ لیکن بارڈر پیٹرول آسام سے آنے والوں اور اسمگلروں کی روک تھام کے لئے بیحد چوکس ہو چکا ہے غفورالرحمٰن میاں کے ساتھ ہی ایک اور قافلہ سرحد کے جنگل میں داخل ہوا تھا تبھی پولیس کے سپاہیوں نے چند اسمگلروں کے تعاقب میں گولی چلا دی۔ پاربتی اور غفور سرپٹ بھاگے۔ مگر ناکہ بندی کو توڑ کر نکلنا ناممکن تھا۔ بھاگتے میں غفور گھپ اندھیرے میں کافی بلندی سے کھڈ میں جا گرا۔

"مگر ذرا اس لڑکی کی بہادری اور عقل دیکھئے ـــــ" ارسلان بھائی نے میلکم مک فرسن کو مخاطب کیا ـــــ "اسے معلوم تھا کہ گیارہ بجے ہماری فیکٹری کا ٹرک فلاں راستے سے گذرتا ہے۔ وہ غفور کو گھسیٹتی ہوئی سڑک کے موڑ تک لے گئی اور جب ٹرک قریب آیا تو ڈرائیور سے التجا کی۔ وہ ان دونوں کو میرے یہاں پہنچا دے۔ اس وقت تک غفور الرحمان بیہوش ہو چکا تھا۔ بارتی یہ بھی جانتی تھی کہ غفور کو لے کر یہاں آنا بے حد خطرناک ہے۔ لیکن اسے ہماری زرینہ بیگم پر بڑا ناز تھا ـــــ"

زرینہ نے فوراً ٹپ ٹپ رونا شروع کر دیا۔

"ارے ارے ـــــ عجیب بیوقوف لڑکی ہو ـــــ" ارسلان بھائی گھبرا گئے۔

کھانے کے بعد آگ کے سامنے بیٹھتے ہوئے میں نے ارسلان بھائی سے کہا

"ایک بات بتائیے۔ اَن گنت انسان سرحد کے دونوں طرف دھکیلے جا رہے ہیں اور باہر کی دنیا میں اس قیامت خیز المیئے پر دھیان دینے کی کسی کو فرصت نہیں کسی کو احساس نہیں کہ ان ہزار ہا بے خانماں، بھوکے، اسٹیٹ لیس انسانوں پر کیا گذر رہی ہے۔ جن کو پاکستانی کی حیثیت سے آسام سے اس طرف روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اور جب وہ یہاں آتے ہیں تو ان کو بھارتی کہہ کر پھر واپس دھکیل دیا جاتا ہے۔ اس المناک صورت حال کے ذمے دار وہ خود تو نہیں۔ ان کا کیا قصور ہے؟"

"حکومتوں کے لئے بین الاقوامی قوانین کی پابندی بھی تو کوئی شے ہے۔ تم غالباً انزاج کی خواہاں ہو۔ حکومتیں ـــــ"

میلکم مک فرسن نے کہنا شروع کیا — "حکومتیں — حکومتیں —!" میں نے چڑکر ان کی بات کاٹی —

"اب ہم ساری دنیا کی بگڑی تو نہیں بنا سکتے —" میلکم مک فرسن نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی — "مصیبت یہ ہے —" انہوں نے اپنا پائپ سلگاتے ہوئے اضافہ کیا — "کہ تم ضرورت سے زیادہ حساس ہو —"

"یہ شخص عفورالرحمان میاں، یہ بھوکا ننگا فاقہ کش ملّاح اور اس کے فاقہ کش ماں باپ اور بہن بھائی غالباً صرف اتنا جانتے ہیں کہ ملکوں کے بیچ میں دیواریں کھڑی ہیں۔ مگر دکھ کی کوئی سرحد نہیں ہے۔ وہ غالباً نہیں جانتے کہ ان گھنے جنگلوں میں آسام کہاں ختم ہوتا ہے اور سلہٹ کہاں سے شروع ہوتا ہے یا یہ کہ اقوامِ متحدہ میں برلن کی سرحد کے سلسلے میں، ان کی نمائندگی پاکستان کو کرنی چاہیئے یا ہندوستانی ڈیلی گیشن ان کی ترجمانی کرے گا۔ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ ان کا بانس کا جھونپڑا اور اننناس اور دھان کا کھیت سرماندی کے کنارے تھا جہاں پُرکھوں کے زمانے سے وہ رہتے آئے تھے۔ اور اب وہ ان کا نہیں — پھر عفورالرحمان میاں اسمگلنگ کی طرف بھی راغب ہو جاتا ہے —"

میلکم مک فرسن نے مجھے ذرا دھیان سے دیکھا۔

"تم غالباً ٹھیک کہہ رہی ہو —" انہوں نے پائپ کا کش لگا کر کہا — "مگر اس صورتِ حال کا کیا علاج ہے —؟"

"آیئے ـــ ماہ جونگ کھیلا جائے ـــ!"
سنتھیا مک نرسن نے شگفتگی سے تجویز کیا۔

کراچی سے میرے تار کا جواب اب تک نہیں آیا تھا۔ دو تین دن بعد میں نے طے کیا کہ شوٹنگ شروع کر دینی مناسب ہے۔

صبح سویرے میں نے ساریوں کے بنڈل نکالے۔ دس دس روپے کی رنگ برنگی ساریاں، پگڑیاں اور دھوتیاں اور چاندی کے گہنے جو میں "اداکاروں" کو تحفے کے طور پر دینے کے لئے ڈھاکے سے خرید کر لائی تھی۔ زرینہ نے خود کو گویا کوسٹیوم ڈیپارٹمنٹ کا انچارج مقرر کیا۔ اکرم خاں مع چپڑاسی کے اپنا ساز و سامان لے کر سری منگل سے بیدھا لوکیشن پر پہنچنے والا تھا۔ میں اور زرینہ اپنے لوازمات کے ساتھ جیپ میں سوار ہونے والے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجی ——— "مسٹر ہربرٹ کننگھم کے فوری آپریشن میں میری مدد کے لئے جلد از جلد ہسپتال پہنچئے۔" ٹی اسٹیٹ کا میڈیکل آفیسر گھبرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"او مائی گاڈ ———" زرینہ نے مایوسی سے ریسیور رکھا۔

"کیا ہوا — خیریت — ؟"

"ہربرٹ کننگھم ایک نوجوان پلانٹر ہے۔ شاید اپنڈی سائیٹس کا آپریشن ہے۔ تمہاری شوٹنگ مس کرنی پڑے گی — خدا حافظ —" وہ جلدی سے اپنی کار میں بیٹھی اور ہسپتال کی طرف اڑنچھو ہوگئی —

"سیٹ" پر بڑی گہما گہمی تھی۔ آس پاس کے گاؤں کے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ بے شمار دُبلے پتلے فاقہ زدہ بچّے چاروں طرف کھڑے حیرت سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ارسلان بھائی کے چار ریکان کے مزدور اور عورتیں جن کو خاص طور پر آج کے دن کے لئے چھٹی دی گئی تھی۔ ڈھول مجیرے سنبھالے کیمپ کے گرد گھیرے کھڑے تھے اور اپنی نئی دھوتیوں اور ساریوں کے بنڈل دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

پھر لڑکیاں ساریاں اور گہنے پہن کر شرماتی ہوئی ایک طرف کو آ کر کھڑی ہو گئیں

"پاربتی کہاں ہے ——؟" میں نے رام نندن سے دریافت کیا۔ وہ چپ

رہا۔

"پاربتی کہاں ہے رام نندن؟"

"بٹیا — وہ پیچھے چھپی بیٹھی ہے — برادری کی اجت کا معاملہ ہے ——"

اس نے رکتے ہوئے کہا۔

میں نے پاربتی کو ڈھونڈنا شروع کیا - وہ ایک جھونپڑے کے پچھواڑے نالاب کے پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی - میں نے کپڑوں کا بنڈل اسے دیا - اس نے منہ نہیں اٹھایا۔

"پاربتی — دیکھو — کتنی سندر ساری ہے - لال لال ایک دم ہرا بلاوز اور یہ دیکھو گہنے - کرن پھول اور طوق — یہ آئنا کی شیشی ہے - تم کپڑے پہن کر آؤ - پھر تمہارا سنگھار کریں گے ۔"

اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا بھی نہیں -

"پاربتی — سب باہر ولایت ما لوگ تمہرا سپنا دیکھیں —— لیو ——"

میں اس کے پاس بیٹھ گئی - اس پر کوئی اثر نہ ہوا - مجھے فکر ہوگئی - وقت نکلا جا رہا تھا - اچانک رام نندن ڈنڈا لئے اس کے سر پر آن کھڑا ہوا ——

"جو بٹیا کہت ہیں کرت کا ہے ناہیں ہے - پھر مار کھیئے ——؟" اس نے گرج کر کہا -

جواب میں میں نے رام نندن کو ڈانٹنا چاہا - مگر اتنے میں پاربتی سرعت سے

سے اٹھی اور بنڈل اٹھا کر ایک جھونپڑے میں گھس گئی جو "گرین روم" کا کام دے رہا تھا۔

جب وہ تیار ہو کر "سیٹ" پر آئی تو اکرم خاں حیرت سے اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا "کیا غضب کا کیمرہ فیس ہے" اس نے کیمرے میں جھانک کر کہا —— اور چہرے کا فاصلہ ناپنے میں مصروف ہو گیا۔

میں نے ایک ببل کے درخت کے نیچے بیٹھ کر اسکرپٹ نکالا جو جابر لکان کے ریلوے اسٹیشن پہنچ کر لکھتے لکھتے اُدھورا چھوڑ دیا تھا۔

تصویر	آواز
فیڈان	بنگالی لوک دھن
۱۔ کلوز اپ دو پتیاں اور	" " "
ایک کلی شوپر امپوزڈ ٹائٹل	" " "
۲۔ چائے کی جھاڑی	" " "
۳۔ چائے کا باغ۔ مزدور لڑکیاں	" " "
۴۔ لونگ شوٹ جنگل۔ ندی	" " "
(ماحول تعمیر کرو)	
۵۔ فیچو گنج کا پل۔ دریا، کشتیاں	چڑیوں کی چہکار۔ پانی کی آواز۔
۶۔ اسٹیمر گھاٹ	بھٹیالی گیت
۷۔ بدم چال۔ ریلوے اسٹیشن	" چائے کے باغات کی یہ حسین
۸۔ مزدور، مسکراتے چہرے	رومان پرور فضائیں جہاں دھرتی
۹۔ چائے کی فیکٹری	کے جیالے بیٹے دھرتی کے مدھر حیات
۱۰ مزدور کام کر رہے ہیں	بخش گیت گاتے ہوئے چائے کی پتیاں

۱۱- مزدوروں کا ناچ شگفتہ چہرے تیار کرتے ہیں -

۱۱۱۱- میں نے کاغذ زمین پر رکھ دیا اور دوربین اٹھا کر سامنے دیکھنے لگی -
اکرم خان کو چاہیئے کہ ہیں شوٹ ساؤ کے جھنڈ سے شروع کرے - میں نے
دوربین کا رخ جنگل کی سمت کیا - دوربل کھاتے راستے پر سے ایک سبز رنگ کی
جیپ گزر رہی تھی اور مسز ریٹیا فریزر اسے چلا رہی تھیں وہ تنہا تھیں -

سکو ئنیس ۱۲ - گھنا جنگل	چاروں طرف اندھیرے گھنے
(ماحول تعمیر کرو)	جنگلوں میں خوبصورت باگھ
ایک جیپ گزر رہی ہے -	چیتے اور ہرن اور دور دور
کلوز اپ - بندوقیں سنبھالے	سے آتے ہوئے سیلانی اور
ہوئے غیر ملکی سیاحوں کے	شکاری ————
مسکراتے چہرے	

میں نے فوراً دوربین گھاس پر رکھ کر رام نندن کو آواز دی - جو نئے کپڑے
پہنے ڈھول گلے میں لٹکائے خوش خوش پھر رہا تھا -

رام نندن —" میں نے دوبارہ پکارا

"بٹیا —" وہ دوڑا ہوا آیا -

"دیکھو ہماری جیپ سے کر سیدھے جاؤ اور میم صاحب کی ہری جیپ کا
پیچھا کرو اور ان کو روک کر ہمارا سلام بولو — جلدی ایک دم —"

"جی بیٹا" رام نندن ترنت ڈرائیور سے بات کرکے مسز فریزر کے تعاقب میں ہوا ہو گیا۔

آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ لیکن رام نندن یا مسز فریزر کا پتہ نہ تھا۔ وقت نکلا جا رہا تھا۔ میں اکرم کی جیپ میں بیٹھ کر جنگل کی طرف روانہ ہوتی۔

لیکن گھنے درختوں سے گھری سڑک سنسان پڑی تھی۔ خود رو اودے پھولوں پر سفید تتریاں اڑ رہی تھیں۔ جھاڑیاں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور پرندوں کی چہکار سے گونج رہی تھیں۔ مسز فریزر کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ میں نے ایک اونچے ٹیلے پر پہنچ کر ڈرائیور سے جیپ روکنے کو کہا اور نیچے اتر کر دوربین کے ذریعے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ راستے کے آگے سے مکمل خاموشی شروع ہوئی تھی۔ اس بلوریں خاموشی میں، زرد پتوں پر چلتی ہوئی وادی کے سناٹے میں داخل ہوگئی۔ نیچے سڑک پر دو کھاسی نوجوان سائیکلوں پر جا رہے تھے اور سفید گھاس ہوا میں لہرا رہی تھی۔

اچانک میری نظر نشیب کی سمت گئی۔ جہاں بانس کے جھنڈ میں سبز جیپ کھڑی تھی۔ اور مسز فریزر کیمرہ سنبھالے سفید پھولوں سے لدی ہوئی ایک "روپی ٹری" کے تنے سے لگی کھڑی تھیں۔ انھوں نے سرخ رنگ کی بے حد چست پتلون پہن رکھی تھی۔

اتنے میں ایک سیاہ رنگ کی فورڈ کونسل دوسری طرف سے آئی اور رواجد

میرے واپس پہنچنے کے چند منٹ بعد مسز فریزر بھی آ گئیں۔ انہوں نے مسکرا کر دور سے ہاتھ ہلایا اور جیپ میں سے کود کر سیٹ پر آ گئیں۔

"ہائی" انہوں نے کہا۔

"گڈ مارننگ مسز فریزر" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"مسز فریزر۔ کیا آپ اس منظر میں حصہ لینا پسند کریں گی؟" میں نے ان کو منظر سمجھایا۔

"شیور — آئی وڈ لو ٹو!"

"تو آئیے تھوڑی سی ریہرسل کر لیں"

"شیور"

میں نے کیمرے کے پیچھے جا کر ان کو دیکھا۔ واقعی ان میں غضب کا "سٹیج سنس" تھا۔ وہ بڑی ادا سے جیپ سے اتریں۔ مسکرائیں۔ مزدوروں کو دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا۔ گاؤں کی لڑکیوں نے ان کو پھول پیش کئے لوک ناچ کے دوران میں بے حد ایکسائٹ منٹ کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے تالیاں بجائیں۔ مکمل امریکن ٹورسٹ۔

وہ مجھ سے اور اکرم خاں سے مسلسل انگریزی میں گفتگو کرتی رہیں۔ اور مزدوروں سے بہت ٹوٹی پھوٹی امریکن اردو میں ایک آدھ بات کی۔ اکرم خاں نے شوٹنگ شروع کر دی۔

چار کی جھاڑیوں کے نزدیک اترا۔ شاید وہ معائنہ کرنے آیا تھا۔ کیونکہ اس کے ہاتھ میں کاغذات تھے اور تیوری پر بل پڑے تھے۔ وہ ایک سنجیدہ شکل والا، ذرا جھکا ہوا طویل القامت آدمی تھا۔ وہ باغ کے سپروائزر سے بات کرنے میں مصروف رہا۔ پھر چند چھوٹے چھوٹے لڑکوں کے سروں پر ہاتھ پھیرا جو بانس کے ڈبوں میں چائے کے بیج کے کیڑے جمع کر رہے تھے۔ اس کے بعد دوسرے باغ کی طرف بڑھا۔ یہاں اس نے ڈھلوان کے پاس کار روک لی اور کاغذات نکالے۔

اچانک اس کی نظر مسز فریزر پر پڑی۔ جو درخت کے نیچے بت بنی کھڑی اسے آتا دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے وہ ٹھٹھک گیا۔ راحت نے نظر بھر کر اسے دیکھا اور درخت کے تنے سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ واجد چند قدم آگے بڑھا۔ پھر ٹھٹھک گیا اور چند سیکنڈ تک چپ چاپ کھڑا راحت کو دیکھتا رہا۔ پھر یک لخت پلٹا — اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کندھے جھکائے کار میں جا بیٹھا اور زنّاٹے سے پہاڑی کے نیچے اتر گیا۔

راحت نے آنکھوں پر ہتھیلیاں پھیریں۔ رومال نکال کر چہرہ پونچھا۔ بال پیچھے کو جھٹکائے۔ گہرا سانس لے کر تن کر کھڑی ہو گئی۔ شانے سیدھے کئے اور آہستہ آہستہ چلتی جیپ میں جا بیٹھی۔ اسی وقت رام سنگھ کی جیپ اس کے قریب جا پہنچی۔ میں نے دوربین آنکھوں سے ہٹائی اور لوکیشن پر واپس آگئی۔

مسز فریزر کی پیشانی پر داہنی طرف پٹی کا کراس بنا ہوا تھا جسے انہوں نے بڑے سلیقے سے بالوں کی سنہری لٹ میں چھپا لیا تھا۔ اکرم خاں نے ان کے اور "اسٹار ٹو انسر" پاربتی کے باری باری کئی کلوز اپ لئے۔

اچانک سورج پر بادل آ گئے۔ اکرم خاں نے کندھے اچکا کر ہاتھ پھیلائے اور آسمان کو دیکھا۔ مسز فریزر ہنسنے لگیں پھر وہ اداسے منہ بنا کر اس طرح چلتی ہوئی جیسے پانی پر رواں ہوں۔ میرے پاس آئیں اور بولیں ۔"

" جی — انڈائٹ ایکسائٹنگ۔ میں نے زندگی میں پہلی بار موی کیمرے کا سامنا کیا ہے۔ انڈائٹ ف..."

" میں بہت خوش ہوں کہ آپ کو یہ اچھا لگا۔ مسز فریزر" میں نے بڑے اخلاق سے جواب دیا۔

" ابھی میرا کام باقی ہے "

" جی ہاں — اگر ایسا — اگر آپ کو زحمت نہ ہو۔ آپ اسی جیپ میں بیٹھ کر جنگل کے راستے سے گزر رہیے۔ میں نے چپراسی کو ابھی اپنے گھر بھیجا ہے کہ میرے بہنوئی کی بندوق لے آتے "

" بندوق — ؟" انہوں نے آنکھیں پھیلا کر مصنوعی طور پر خوفزدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

" جی ہاں " آپ کا شاٹ بندوق کے ساتھ بھی بہت عمدہ رہے گا۔

باقی "شکاریوں" کو ہم کل پرسوں جمع کرلیں گے۔

"تو اب میں شکار پر جاؤں گی — ؟ لیکن ابھی تو میں لوک ناچ دیکھ رہی تھی۔ یہ کیسے ہوگا —؟ مسز فریزر نے غضب کے بھولپن سے پوچھا

"میڈیم وہ سب ایڈیٹنگ کے وقت دیکھا جائے گا۔ ابھی آپ مہربانی سے ذرا جیپ اسٹارٹ کردیجئے" اکرم خاں نے جو ایک اکل کھرا پٹھان تھا۔ ذرا جھنجھلا کر جواب دیا۔ بادل ہٹ گئے تھے۔

"شیور —"

اکرم خان نے کیمرہ چلادیا۔ مگر چند منٹ بعد گھرے بادلوں نے دوبارہ سورج کو ڈھانپ لیا۔

"لنچ بریک —" اکرم خاں نے آواز دی۔

نذیرینہ کا ملازم جیپ میں سے کھانے کی ٹوکریاں نکال کر لایا ——

"آئیے مسز فریزر —" میں نے کہا۔

جی نہیں شکریہ — میں صبح بہت کافی ناشتہ کرکے چلی تھی — اور میں دوپہر کا کھانا کبھی نہیں کھاتی۔ میں اتنی دیر میں چند ضروری خط لکھ لوں۔ جب میری ضرورت ہو مجھے فوراً بلا لیجئے گا" مسز فریزر نے کہا اور تھوڑی دور جاکر ایک خالی جھونپڑے کے برآمدے میں بیٹھ گئیں اور بیگ سے کاغذ نکال کر لکھنے میں منہمک ہوگئیں۔

تیسرا پہر آگیا۔ سائے طویل ہوئے۔ دن ڈھلنے لگا۔ مگر آسمان صاف نہیں ہوا۔ مسز فریزر جھونپڑے کے برآمدے میں لگا تار سگریٹ پی کر لکھنے اور ایک کتاب پڑھنے میں مصروف رہیں۔

"آخر کب تک انتظار کیا جاتے ہے"؟ اکرم خاں نے عاجز آکر کہا —

"جب تک بادل نہ چھٹیں — اکرم خاں —" میں نے جواب دیا۔

"کبھی تو سورج نکلے گا"

"اور اگر بالکل نہ نکلا تو — ؟ آج کا دن بالکل بیکار گیا —"

مجب تک وقت ہمارے ہاتھ میں ہے ہم بادل چھٹنے کا انتظار کریں گے ۔" میں نے مضبوطی سے جواب دیا ۔ وہ ٹہلتا ہوا گاؤں کی طرف چلا گیا ۔

جاڑے کی شام بہت سرعت سے وادی پر چھانے لگی ۔ چپڑاسی بندوق لے کر ابھی نہیں آیا تھا کہ پیک اپ کا وقت آگیا ۔ اتنے میں مسٹر میلکم مک فرسن کی کار ناٹے سے آکر سیٹ کے سامنے رکی اور مسٹر مک فرسن بھاگتے ہوئے ، بے حد سراسیمہ میری طرف آئے

"مسز فریزر یہاں ہیں — ؟ ان کو اجازت دو کہ میرے ساتھ فوراً چلی چلیں —" ہماری بھرکم اور متین مسٹر مک فرسن کا چہرہ سفید ہو رہا تھا ۔

مسٹر فریزر ۔ جنہوں نے سارا دن جھونپڑے میں بیٹھے بیٹھے گزار دیا تھا ۔ مسٹر مک فرسن کی آواز سن کر ہماری طرف آئیں ۔

"ریٹا — فوراً میرے ساتھ چلو"

"کیا ہوا ۔ خیریت — ؟"

میلکم مک فرسن نے جواب دیئے بغیر مسز فریزر کو گھسیٹ کر کار میں ڈھکیل دیا اور اپنی جگہ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے سر نکال کر مجھے آواز دی —" میں رات کو تمہارے یہاں آؤں گا —" دوسرے

لمبے کار درختوں میں غائب ہوگئی

" اداکاروں " کی ٹولیاں اپنے اپنے جھونپڑوں کی طرف روانہ ہوگئیں۔ شرماتی لجاتی لڑکیاں منہ میں پلو ٹھونس کر یا کھلکھلا کے ہنستی ہوئی ٹولیاں بنا بنا کر ادھر ادھر بکھر گئیں۔ انہوں نے اپنی پھٹی پرانی ساریاں دوبارہ لپیٹ کر اپنی نئی ساریاں کل کی شوٹنگ کے لئے سنبھال لی تھیں۔ پاربتی ایک درخت کے نیچے بیٹھی اسی طرح چپ چاپ اپنے گہنے اتار رہی تھی۔ اور بار بار بے چین، دہشت زدہ نگاہیں اٹھا کر دور دور جنگل کے راستے کو دیکھ لیتی تھی۔ جس پر اب کہرہ منڈلا رہا تھا۔

پھر اس نے اپنی نئی ساری اور گہنوں کی پوٹلی بنا کر بغل میں دابی اور پیر کے انگوٹھے سے کنکروں کو ٹھوکریں مارتی مارتی اپنے گاؤں کی طرف چل دی۔

جس وقت ہماری جیپ گاؤں کی ڈھلوان سے اتر رہی تھی۔ رام نندن دوڑا دوڑا آیا "بٹیا — بٹیا — اپنے کاگج بھول گئیں۔ یہ لیجیے" میں نے رام نندن کے ہاتھ سے ڈو کومنٹری کا فائیل لیا۔ اس کے ساتھ ہی چند اور کاغذات تھے۔ میں ان کو ترتیب دینے لگی تو ایک اجنبی تحریر دکھائی پڑی۔ میں نے ذرا تعجب سے اس پہ سرسری نظر ڈالی۔

سلہٹ۔

۲۳ دسمبر ۱۹۶۰ء

میرے پیارے ابا جان۔ تسلیم۔

راشدہ پھوپھی کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ کی طبیعت زیادہ خراب

ہے۔ میں نے اندرو کے ہسپتال میں اسپیشل وارڈ کا انتظام کروا دیا ہے۔ آپ کے آپریشن کے لئے فوراً وہاں داخل ہو جایئے۔ میرا دل آپ کو دیکھنے کے لئے تڑپتا ہے۔ اور میں بیحد پریشان ہوں اور جلد آپ کے پاس پہنچنے کی کوشش کروں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین۔ میں یہ خط جلدی میں لکھ رہی ہوں تاکہ شام کی گاڑی سے نکل جائے۔ امی جان کو میرا دست بستہ آداب کہیئے گا سکینہ اور رابعہ ڈھاکے میں خیریت سے ہیں۔

آپ کی تابعدار بیٹی محمودہ

تحریر پر چند آنسو بھی ٹپکے تھے۔ کیونکہ سیاہی ایک آدھ جگہ سے بہہ گئی تھی۔ ساتھ ہی لفافہ تھا۔

جناب مولوی عبدالصمد صاحب

مکان نمبر ۱۹ متصل مدرسہ عالیہ اسلامیہ

عثمان گنج - ضلع سیہور

سابق بھوپال اسٹیٹ

مدھیہ پردیش - انڈیا

"یہ کہاں سے ملا۔ رام تندن ---- ؟" میں نے پوچھا۔

"بٹیا اوسارے سے یہ ڈھیر سارے پتے جوڑ کر لایا ہوں -" اس نے

جواب دیا۔

جیپ آگے بڑھی۔ وادی میں پہنچتے پہنچتے کہرے کے ایک ریلے نے آلیا۔ اور بلوچستان کی برف پوش کوہستانی خانقاہ — خانہ بدوشوں کے سردار کے زرین خیمے اور الغوزے کی موسیقی اس کہرے میں ہمیشہ کے لئے ڈوب گئی۔

مجھے بے حد ندامت ہوئی کہ میں نے انجانے میں کسی کا خط کیوں پڑھ لیا۔ لیکن — محمودہ بنت عبدالصمد — تم کو اس بہیم خود فریبی، اس فرار مسلسل سے کیا حاصل ہوا — ؟ کچھ تو بتاؤ — کچھ تو کہو

میں نے خط لفافے میں رکھ کر ڈرائیور سے کہا کہ کرنل مورگن کے بنگلے کی طرف سے ہوتا چلے اور اندر جا کر خط فریزہیم صاحب کو دے دے۔ جو وہ جلدی میں گاؤں کے جھونپڑے میں چھوڑ کر آئی تھیں۔

لیکن کرنل مورگن کا بنگلہ خاموش پڑا تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ سب لوگ ریلوے اسٹیشن گئے ہیں۔

میں نے گھر کے راستے میں شوٹنگ کے متعلق فائل سمیٹا۔ لیکن ایک ڈوپ سیٹ کے نیچے سے چند اور کاغذ نکلے۔ ایک کاغذ پر بہت سے درخت بنے تھے۔ ایک بڑا درخت اور اس کے سائے میں ایک چھوٹا سا درخت۔ ایک بڑا درخت — ایک اور کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں

بنی تھیں۔ پانچ چھ مرتبہ دہرایا گیا تھا۔ میں کہاں کہاں سے گزر گئی — میں کہاں کہاں سے۔

اور اس کے بعد ایک کونے میں لکھا تھا۔

شاید کہ چمن مہکا، شاید کہ بہار آئی دنیا کی وہی رونق، دل کی وہی تنہائی

"مسٹر ہربرٹ کننگھم کیسے ہیں —؟" گھر پہنچتے ہی میں نے زرینہ سے دریافت کیا جو تھکی ماندی اپنی مسہری پہ لیٹی تھی۔

"ہربرٹ کا آپریشن —" زرینہ نے کروٹ بدل کر جواب دیا۔ "اپنڈی سائٹس کا نہیں تھا۔"

رات کو ہم لوگ ابھی کھانے کی میز پہ ہی تھے کہ ہرکارے نے میرے نام تار لاکر دیا۔

"ریفرنس آپ کا تار — اگر یہ صورت ہے تو ڈڈ کو منڑی کینسل کر دیجئے اور واپس آجایئے۔

"ونڈرفل" نذرینہ نے کہا — "اب تم اطمینان سے چند روز یہاں رہو چھٹی لے کر — کیا خیال ہے —؟

اسی وقت ملازم نے اناؤنس کیا — "مک فرسن صاحب میم صاحب —"

میلکم اور سنتھیا مک فرسن کمرے میں داخل ہوئے میلکم کا چہرہ

ستا ہوا تھا۔

"ہربرٹ کا انتقال ہوگیا۔ ڈھاکہ ہاسپٹل سے تار آیا ہے۔"

انہوں نے تار ارسلان بھائی کی پلیٹ کے نزدیک سرکا دیا

اس رات نیم تاریک ڈرآئنگ روم کے آتشدان کے شعلوں کی روشنی میں میلکم نے اس طرح بات کی۔ جیسے ساری زندگی کا پوسٹ مارٹم کر رہے ہوں ۔

"کاش چارلس فریزر صرف ایک گھنٹہ دیر سے آتا۔" سنتھیا کمفرسن نے کہا۔

"یا اینگس اور نورا اپنا بنگلہ ریٹا فریزر کے حوالے کر کے ڈھاکے نہ چلے جاتے۔" مسٹر کمفرسن بولے۔

"مگر ریٹا یزرتو کرنل مورگن کے یہاں ٹھہری تھیں ــــ ؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں — مگر ایڈیتھ مورگن کی ریٹا سے پہلے روز سے نہیں بنی۔ دراصل کرنل کی دوستی چارلس فریزر سے جنگ کے زمانے سے تھی اور وہ محض کرنل سے ملنے کے لئے ہی ڈھاکہ سے یہاں آیا تھا۔"

چارلس کینیڈین ہے۔ اور ہر کینیڈین اور امریکن کی مانند اسے بھی ٹوکل کلر دیکھنے کا خبط ہے۔ وہ اپنے ایک اور پرانے دوست بل مک گریگر سے ملنے چاند پور نیکان گیا اور وہاں سے شام کو ہی واپس آگیا کیونکہ بل کو کسی ضروری کام سے چٹاگانگ جانا تھا۔ جب چارلس واپس آیا تو کرنل مورگن نے اس سے کہا کہ وہ نواب یتیم پاشا سے ملانے لے جائیں گے۔ جو آسام کے مغل عہد کے نوابین کی آخری یادگار ہیں۔ یتیم پاشا یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ چارلس اور کرنل کے وہاں پہنچنے پر نواب صاحب نے فوراً پروگرام بنایا کہ وہ مہمانوں کو شکار کھلانے سندربن لے جائیں۔ چنانچہ چارلس نے ریٹا کو یہاں فون پر اطلاع دی کہ وہ کئی روز کے لئے سندربن جا رہا ہے۔"

میلکم مک فرسن نے پائپ منہ سے نکال کر راکھ دانی پر کھٹ کھٹایا اور اپنے چارخانہ ٹوئیڈ کے کوٹ کی جیب میں سے ماچس ڈھونڈ کر نکالی۔ نیا تمباکو بھر کے پائپ جلایا اور چند لمحوں تک شعلوں کو غور سے دیکھتے رہے۔ ہم سب ہمہ تن گوش ان کی طرف متوجہ تھے۔

"بے چارہ ہربرٹ کننگھم — میلکم مک فرسن نے مجھے مخاطب کر کے

دوبارہ بات شروع کی "ایک نوجوان انگریز پلانٹر تھا اور حال ہی میں یہاں آیا تھا۔ وہ ایک بڑا جذباتی اور بھولا بھولا سا لڑکا تھا۔ ٹی اسٹیٹ پر اس کی ہم دونوں سے بے حد دوستی ہو گئی اور میں اسے اپنے بیٹے کی طرح سمجھنے لگا"

میلکم نے بہت آہستہ سے اپنی بھوئوں پر ہاتھ پھیرا۔

ہربرٹ بہت خوش شکل اور بہت دل پھینک لاابالی قسم کا بچہ تھا"

تم کو یاد ہے نرینہ، چند روز ہوتے ہم دونوں تمہیں کرنل کے یہاں ڈنر پر مدعو کرنے آئے تھے ۔؟ اسی رات ہربرٹ کی ملاقات ریٹا سے ہوئی۔

" شام کو شراب کا دور چلا۔ ایڈتھ مورگن اپنی الکحل آسانی سے نہیں سہار سکتیں۔ اس رات ان پر دورہ سا پڑ گیا۔ اور انہوں نے اچانک ریٹا فریزر کو طعنے دینے شروع کئے۔ جواباً ریٹا نے قہقہہ لگایا۔ کچھ دیر بعد ہم لوگوں نے دیکھا کہ ریٹا ڈرائنگ روم سے غائب تھی۔ اور جب دوبارہ نظر دوڑائی تو ہربرٹ کو بھی موجود نہ پایا۔

" اب سارے مہمانوں پر نشہ چڑھ چکا تھا۔ تم لوگ جانتے ہو کہ ہم اسکاٹ لوگ بوتل پر عاشق ہیں اور بڑے بڑے پیگوں کو میز کے نیچے پہنچا دیں۔ مگر اس رات تو ریٹا کی وجہ سے عجب ہڑبونگ رہا تھا۔

" رات بھیگ چلی تو میں نے میلکم سے گھر چلنے کے لئے کہا۔ کیونکہ میں اسکاٹ

تو ہوں مگر ایک کٹر مذہبی پریسبی ٹیرین پادری کی بیٹی بھی ہوں اور مجھے اس طرح کی بے تحاشا مے نوشی سے دہشت ہوتی ہے۔ چنانچہ میں اور میلکم کرنل اور ایڈیتھ کو شب بخیر کہہ کر باہر آگئے تو کیا دیکھا کہ برآمدے کے نیچے باقاعدہ فوجداری ہو رہی ہے ―" سنتھیا مک فرسن نے اپنے شوہر کی بات مکمل کی۔

" ارے ―" ارسلان بھائی نے استعجاب سے کہا۔

" وہاں بیٹا تو نفتے میں مسرور نزدیک کھڑی قہقہہ لگا رہی تھی۔ اور چارلس فریزر اور بے چارہ ہربرٹ ایک دوسرے کی ٹھکائی میں مصروف تھے۔ اسی وقت سارے مسرور مہمان باہر نکل آئے مگر کسی نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش نہ کی ― اور اس منظر سے محظوظ ہوتے رہے۔

" اتنے میں ریٹیا نے بیچارے ہربرٹ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا چاہا تو چارلس نے آگ بگولہ ہو کر اسے دھکا دیا اور وہ دور جا پڑی اور اس کی پیشانی میں چوٹ آگئی۔

دوسری صبح سویرے چارلس کرنل کے چھوٹے طیارے کے ذریعہ چاندپور نیکان روانہ ہو گیا۔ لیکن شام کو ہی واپس آن پہنچا۔ دوسرے دن کرنل اور چارلس نواب بیتیم پاشا کے ساتھ سندربن چلے گئے

" تم جانتی ہو زرینہ ۔ بوڑھے اینگس اور نورا ڈنکن کتنے شفیق اور پیارے لوگ ہیں ۔ وہ دونوں اس رات دعوت میں نہیں آئے تھے ۔ کیونکہ

اینگس کی طبیعت اچھی نہیں تھی - صبح کو چارلس اور کرنل کے چاند پور بکان چلے جانے کے بعد ایڈیتھ ڈنکنز کے گھر گئیں - ان کو مختصراً رات کا واقعہ سنایا اور فوراً اسے کہا کہ انہیں اعصاب کی شکایت ہے اور وہ تنہا ریٹا کی حسب دل خواہ میزبانی نہ کر سکیں اور ڈنکنز سے مشورہ طلب کیا -

اب یہ بڑی آک ورڈ صورت حال تھی - کیونکہ پچھلی رات نشے کی حالت میں ایڈیتھ بھی ریٹا کو جلی کٹی سنا چکی تھیں اور مار پیٹ اور جھگڑے کے بعد صبح صبح چارلس اسی طیش کے عالم میں ریٹا کو ہمراہ لئے بغیر اپنی سیاحت اور شکار کے لئے روانہ ہو گیا تھا - اب ایڈیتھ کہہ رہی تھیں کہ ان کے اعصاب کمزور ہو گئے ہیں -

جس وقت میلکم مک فرسن بات کر رہے تھے - مجھے دفعتاً خیال آیا کہ راحت عرف ریٹا ان عورتوں میں سے ہے - جسے دوسری عورتیں بے طرح ناپسند کرتی ہیں اور مرد جن پر جان چھڑکتے کو تیار رہتے ہیں - نذرینہ کے قصے کے مطابق ڈھاکے کی مسز وازنگٹن کے اعصاب بھی خراب ہو گئے تھے

میلکم نے بات جاری رکھی "چنانچہ فرشتہ خصال فوراً ڈنکن نے کہا کہ وہ دوسرے دن اینگس کے میڈیکل چیک اپ کے لئے ڈھاکے جا رہی ہیں - اس دوران میں چارلس فریزر کی سندربن سے واپسی کے وقت تک ریٹا یقیناً ان کے یہاں گئے اور ریٹا کو اپنے یہاں قیام کرنے کے لئے مدعو کیا - اور کہا کہ

کہ ان کی عدم حاضری میں ان کے ملازمین ریٹا کا پورا خیال رکھیں گے۔ ریٹا بہت خوش ہوئی اور بولی کہ اسے فوٹوگرافی کا خبط اور ان کا خوش منظر بنگلہ اور سامنے کی سینری اس کے اس شوق کے لئے آئیڈیل ثابت ہوگی۔ چنانچہ ریٹا ڈکنز سے یہاں منتقل ہو گئی اور اس کے نئے میزبان ڈھاکہ روانہ ہو گئے۔۔۔"

"اور اب یہ کہنا غیر ضروری ہوگا کہ خواتین کی صبح گیارہ بجے کی ماہ جونگ اور کافی پارٹیوں کی گریپ وائن کے ذریعے یہ سارا قصہ کم از کم ایک سو میل کے ریڈیس میں بخیر و خوبی پھیل گیا۔"

سنتھیا مک فرسن نے کہا "تم لوگ اس فلم کی تیاریوں کے سلسلے میں بہت مصروف تھیں۔ اس لئے تم تک یہ بات نہ پہنچ سکی۔ تین چار روز ہوئے بس نے مسز مک ڈانلڈ کی کافی پارٹی میں مسز مک گریگر کو یہ بھی کہتے سنا کہ ریٹا فرنرز امریکن نہیں۔ بلکہ دراصل کیبل کٹا اینگلو انڈین ہے اور رابڈ تھ نے جو تحقیر آمیز رویہ ریٹا کے ساتھ اختیار کیا۔ اس کی ایک وجہ دراصل یہ بھی تھی کہ ایڈتھ کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی گلیمرس مہمان ہاف کاسٹ ہے۔"

"اس پچھلے آٹھ دن میں ہربرٹ مجھ سے فیکٹری میں روزانہ ملتا تھا۔" میلکم نے کہا۔۔۔ "اور ریٹا کے لئے دیوانہ ہو چکا تھا۔ میرا خیال تھا کہ

یہ ذہنی ہیجان ہے اور چارلس کی واپسی پر یہ سارا قصہ آپ سے آپ ختم ہو جائے گا۔ چارلس فریزر کے متعلق میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ایک بے حد حساس اور زخمی شیر کی مانند بپھر جانے والا انسان ہے اور ربیٹا کو بے طرح چاہتا ہے ۔۔۔"

"چارلس کام کیا کرتا ہے ۔۔۔؟" ارسلان بھائی نے میلکم کی بات کاٹ کر دریافت کیا۔

"کولمبو میں حکومت سیلون کے لئے کسی نوع کا ایڈ وائزر ہے۔ بمبئی میں ربیٹا سے ملاقات ہوئی۔ اب کینیڈا واپس جانے سے قبل سارے برصغیر کی سیر کرنے نکلا ہے۔ سلہٹ وہ اپنے پرانے فوجی ساتھی کرنل ہورگن سے ملنے آیا تھا۔"

"تم نے ہربرٹ کو سمجھایا نہیں ۔۔۔؟" ارسلان بھائی نے پوچھا۔

"سمجھایا ۔۔۔ مگر اس پر عشق کا جنون سوار تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اس نے زندگی بھر ایسی مکمل عورت نہیں دیکھی۔ ایسی عورت جس کے لئے ALL WOMAN کی اصطلاح رائج ہے۔"

"مکمل عورت ۔۔۔" زرینہ نے دہرایا۔ قاسم نے بھی صنوبر کو چھوڑتے وقت فرحت کے لئے یہی کہا تھا۔

"اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بے چارے ہربرٹ نے یہ سارا ہفتہ

پہاڑی والے بنگلے پر گذارا ــــــ" میلکم مک فرسن نے کہا۔ ارسلان بھائی نے آتشدان کی آگ تیز کی۔

"آج صبح ــــــ" میلکم مک فرسن نے سبز چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ریٹا ہاہت سویرے ہی اُٹھ گئی تھی۔ رات اس نے نورا ڈنکن کی آیا سے کہا تھا کہ وہ علی الصبح تصویریں کھینچنے کے لئے باہر جائے گی۔ چنانچہ اس نے صبح اُٹھ کر جلدی سے بریکفاسٹ کیا اور انگس ڈنکن کی جیپ لے کر کھاسی گاؤں کی طرف نکل گئی۔

" اور آج ہی صبح منہ اندھیرے چارلس اور کرنل سندربن سے واپس آن پہنچے۔ گھر پر ایلمہ نے بتایا کہ ریٹا ڈنکنز کے یہاں اُٹھ گئی ہے۔ لہٰذا چارلس سیدھا پہاڑی والے بنگلے پر پہنچا۔

اس وقت صبح کے سات بجے تھے۔ ملازم ابھی شاگرد پیشے ہی میں تھے۔ صرف نورا کی آیا بنگلے پر موجود تھی۔ وہ چارلس کو پہچانتی نہیں تھی۔ چارلس نے اس سے پوچھا کہ ریٹا میم صاحب کا بیڈ روم کدھر ہے۔ آیا نے گھبرا کر مہمان کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ چارلس سیدھا ہارہٹلی کے بیڈروم میں داخل ہوا تو وہاں بے چارہ ہربرٹ سو رہا تھا۔

وہی بندوق جسے چارلس فرینز شکار کے لئے سندربن لے گیا تھا اس کے کندھے سے آویزاں تھی۔

"لیکن عدالت میں وہ یہ بیان دے سکتا ہے کہ سندربن سے یہاں تک کی پرواز کے دوران میں وہ تھکان دور کرنے کے لئے متواتر شراب پیتا رہا تھا اور اس کے ہوش وحواس قائم نہ تھے۔ اس کے بہت سے دوست اور شناسا یہی گواہی دیں گے کہ وہ بے انتہا پیتا ہے۔ بلکہ عادی شرابی ہے۔" منتھیا لک فرسن نے کہا۔

"جس وقت آج صبح صبح مجھے ڈاکٹر سعید نے فون کیا کہ ہربرٹ کا فوری آپریشن کرنا ہے ــــ"

"مگر کسی نے ریٹا فریزر کو کیوں نہیں تلاش کیا ــــ؟" میں نے زرینہ کی بات کاٹی۔

"اول تو یہاں جنگلوں میں کسی کو ڈھونڈنا بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ دوسرے میرے خیال میں مناسب یہی تھا کہ مسنر فریزر موقع واردات پر نمودار نہ ہوں ــــ" میلکم نے جواب دیا۔

"افوہ ــــ کیا قیامت کا دن گزرا ہے۔" زرینہ نے کہا۔

"اور کمال ملاحظہ ہو۔ میں ارسلان بھائی کو اطلاع دینے کے لئے یہاں آیا تو عین اس وقت آپ کا چپڑاسی یہ پیغام لے کر وارد ہوا کہ آپ نے مسنر فریزر کے لئے بندوق منگوائی ہے۔ میرے تو یقین جانو ایک لمحے کے لئے چھکے چھوٹ گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں ایلیس ان ونڈرلینڈ والی دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔

بہرحال معلوم ہُوا کہ تم ریٹا فرینزر کو فلمی ہیروئین بنائے ڈال رہی ہو اور اس طرح یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ کہاں ہیں۔

"چارلس اور ریٹا دو پولیس افسروں کی معیت میں رات کی ٹرین سے ڈھاکے روانہ کئے جا چکے ہیں۔ میں ڈھاکے میں مقیم کینیڈین ڈپٹی ہائی کمشنر کو فون کر چکا ہوں۔ خُدا سب پر رحم کرے۔" میلکم نے بات ختم کی۔

"اب راحت ـــ آئی مین ـــ ریٹا کا کیا ہوگا۔؟" زرینہ نے پُوچھا۔

"ابھی چارلس اور ریٹا کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ غالبًا قانونی لحاظ سے ریٹا کا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں۔"

زرینہ نے سرصوفے کی پشت پر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔

"ارسلان ـــ وہ تار مجھے دینا۔" میلکم نے کہا۔ ارسلان بھائی نے تار اُٹھا کر دیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہربرٹ کے والدین کو کیا لکھوں۔ وہ ان کا اکلوتا لڑکا تھا۔" میلکم مک فرسن کہہ رہے تھے۔

کمرے میں خاموشی چھاگئی۔ آتش دان میں لکڑیاں چٹخیں۔ ہلکی سبز دیوار پر روشن ڈائیل نے رات کا ڈیڑھ بجایا۔

میلکم نے رومال سے اپنی نم پلکیں خشک کیں اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم لوگ میاں بیوی کو رُخصت کرنے کے لئے برآمدے میں نکلے۔ چاروں طرف چاء کے باغات اور بانس کے جھرمٹوں پر کہرہ چھایا ہُوا تھا۔ چند منٹ تک ہم پانچوں ڈوبتے چاند کی مدھم چاندنی میں چپ چاپ کھڑے رات کی آوازوں کو سُنتے رہے۔ میلکم اور سنتھیا مک فرسن شب بخیر کہہ کر کار میں بیٹھے اور اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

جس روز میں چار بگان سے واپس جا رہی تھی۔ زرینہ نے راستے
میں ارسلان بھائی سے دفعتاً پوچھا ــــ " ارسلان ایک بات بتایئے
مکمل عورت کیسی ہوتی ہے ــــ ؟ ALL WOMAN — ؟ "
" معلوم نہیں ــــ " انہوں نے جواب دیا ــــ کار ایک دھچکے سے
ساتھ پہاڑ کی ڈھلوان سے اُتر کر کچی سڑک پر آگئی۔

شام کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ مزدور عورتوں کی ٹولیاں اپنے
جھونپڑوں کی سمت لوٹ رہی تھیں۔ گاؤں میں دیئے جلنے لگے۔
اچانک ایک موڑ پر پاربتی کی زرد ساری کی جھلک دکھلائی دی۔
کار دیکھ کر وہ ٹھٹھکی اور بندگی کے لئے ہاتھ جوڑے۔ پھر وہ چار کی ٹوکری
کمر سے باندھے، تیز تیز قدم رکھتی " روپی لڑی "، سے جھرمٹ میں غائب
ہوگئی ــــ سانجھ بھئی اور دیا جرے۔

سُرخ پھولوں سے دہکتے ہوئے گھنے درختوں کی پتیاں سرسرائیں۔

— پیانہ آتے پاس۔ پپیہے نے کہا —

"آج رام نندن کہہ رہا تھا کہ پاربتی کا گونا ہونے والا ہے۔ برادری نے فیصلہ کر دیا" زرینہ نے کہا۔

ڈوبتے سورج کی کرنیں "دو پتیوں اور ایک کلی" کی جھاڑیوں سے سرک کر

نیہن سے دوگنگ بہیں، کوئل نے کہا۔

اندھیرے میں جاگریں۔

— ڈوبن لاگی آس، پپیہے نے کہا —

نشیب میں ندی کنارے دھندلکا پھیل چکا تھا، لالہ رنگ افق پر دھواں اُٹھ رہا تھا۔

— ندی کنارے دھواں اٹھت ہے۔ میں جانوں کچھ ہوئے جا کارن جوگن بھئی، وہی نہ جلتا ہوئے۔"

زرینہ نے کہا —

اُونچی نیچی سڑک پر دھول اُڑاتے ہوئے ہم تینوں خاموشی سے سری منگل کی طرف بڑھتے رہے۔ راستے کے دونوں طرف ٹیلوں پر سندھیا مالتی کھلی تھی۔ جو شام پڑے مہکتی ہے مگر ویرانے میں اس کا قدرداں کوئی نہیں۔ دفعتاً میں نے زرینہ سے پوچھا۔

" زرینہ بی بی ــــ راحت اور واجد صنوبر اور قاسم اور فرحت کے متعلق تو معلوم ہو گیا۔ لیکن شمشاد کا کیا ہوا ــــ وہ اب کہاں ہے۔ وہ جس کی وجہ سے کہانی شروع ہوئی۔"

" کہانی شروع ہونے کی کوئی ایک وجہ نہیں ہوتی ــــ بی بی اور نہ اس کے خاتمے کی کوئی ایک وجہ ہے۔ زرینہ نے کہا۔"

" یہ درست ہے زرینہ بی بی ــــ تمہارا فرمانا میرے سر آنکھوں پر ــ پھر بھی، اس شمشاد کا بقول شخصے کیا بنا ــــ؟"

" مرزا شمشاد علی بیگ ___ " زرینہ نے ایک کھڑکی کا شیشہ چڑھاتے ہوئے جواب دیا ___ " اب ٹی اسٹیشن پر ریسرچ ڈائریکٹر ہے۔ داڑھی رکھ لی ہے جماعت اسلامی کا معتقد ہے۔ اپنی بیوی کو جو اس کی خالہ کی لڑکی ہے، پردہ کرواتا ہے۔ اسٹیشن پر جب اکا دکا سیاحوں کی ٹولیاں یا دورے پر آنے والے سرکاری افسران آ کر اترتے ہیں۔ تو وہ انگریزوں کو اپنی جیپ میں لفٹ دیتا ہے۔ چائے باغان کی دنیا سے ان کو دور سے متعارف کرا دیتا ہے اور داڑھی کے اندر ہنستا رہتا ہے۔ اکثر دوران گفتگو میں تبلیغ اسلام بھی کرتا ہے۔ "

ارسلان سبحانی خاموشی سے کار چلانے میں مصروف رہے۔ اب دور سے سری منگل کے ڈاک بنگلے کی ٹمٹماتی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہم تاریک رات میں اسٹیشن کی جانب رواں رہے۔ آم کے درختوں میں ٹی ریسرچ اسٹیشن اور اس کے بنگلوں کی روشنیوں کی جھلک دکھلائی دی۔ کچھ دیر بعد ہم ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے جس کے سنسان پلیٹ فارم کے مختصر سے برآمدے میں ایک اکیلا مسافر اکڑوں بیٹھا اخبار کے کاغذ جلا جلا کر آگ تاپ رہا تھا۔

ٹرین حسب معمول ایک گھنٹہ لیٹ تھی۔ بیرئیروں کے قریب کار ٹھہرا کر ہم انتظار میں مصروف ہو گئے۔

" زرینہ بی بی ___ " میں نے دور تاریکی میں غائب ہوتے ہوئے تار کے کھمبوں کو دیکھتے ہوئے سردی سے کانپ کر کہا۔

" اگر تم کو ٹروتھ سیرم TRUTH SERUM کا انجکشن لگا دیا جائے تو اس کے بعد تم کس قسم کا رسلٹ لیٹر، لکھ کر آئینے کو بھیجو گی ---؟"

" بی بی" زرینہ نے سوں سوں کر کے جواب دیا" اگر تم کو ٹروتھ سیرم کا انجکشن لگا دیا جائے تو اس کے بعد تم کس قسم کی ڈکو منٹری بناؤ گی ---؟"

کمرہ گمرا ہو گیا۔ ارسلان بھائی نے سگریٹ جلایا تو لائیٹر کی روشنی زور سے چمکی۔ کچھ دیر بعد زرینہ نے سر ہلا کر فرانسرماتے ہوئے کہا --- بی بی --- ایک سوال مجھے عرصے سے پریشان کر رہا ہے۔"

" فرماؤ"

" خدا نے یہ دنیا کیوں بنائی ---؟"

" ایں ---؟"

" ہاں --- کیوں ---؟ آخر کیوں ---؟ مجھے اس کی کوئی وجہ بتاؤ ---"

ارسلان بھائی نے ادھ جلا سگریٹ کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور دوسرا سگریٹ جلایا۔

" یہاں تین سال تنہائی میں زندگی گزارنے کی وجہ سے مجھے پڑھنے کا موقعہ مل گیا۔ جو میں ڈاکٹری کے چکر کی وجہ سے پہلے کبھی پڑھ نہ سکی تھی اور بی بی --- میں نے بہت پڑھ ڈالا۔ مختلف فلسفے اور مختلف مذاہب ہندومت اور

بدھ مت اور اسلام اور تصوف اور کیتھولی سی زم۔ مگر اس سوال کا جواب مجھے نہ ملا کہ آخر اس ذات مطلق نے دنیا بنائی ہی کیوں ـــــ یہ لیلا کس لئے رچائی آخر ـــ میں تو سمجھتی ہوں کہ مہاتما بدھ بھی دراصل ایک مرتبہ افیم کھا گئے تھے۔ یہ نروان وغیرہ سب اسی کا نتیجہ تھا اور اگر ـــــ" اس نے کھنکھناتے ہوئے بات جاری رکھی۔

"اگر پانچ منٹ کے لئے فرض کر لو ـــ"

"ہاں ـــ اگر پانچ منٹ کے لئے فرض کر لو ـــ" میں نے دہرایا۔

"کہ آپ سے آپ ارتقاء ہو گیا۔ تو ارتقاء بھی کیوں ہوا بھائی ـــ ؟ کوئی ٹُک تھی ـــ ؟ وجہ تھی ـــ ؟"

دور سے گڑگڑاتی کہرے کو چیرتی ٹرین اسٹیشن پر آپہنچی۔ میں نے اٹیچی کیس سنبھالا۔ قلی نے ڈبے سے اسباب نکالا۔ میں ٹرین میں سوار ہوئی۔ ارسلان بھائی نے گارڈ سے بات کی۔ ڈبہ خالی پڑا تھا۔ "چٹخنیاں اندر سے اچھی طرح چڑھا لینا۔"

ارسلان بھائی نے فکر کے ساتھ کہا۔ میں نے ایک بار پھر خوابیدہ سلہٹ کو خدا حافظ کہا ـــــ میری پیاری کزن زرینہ اور ارسلان بھائی خاموش پلیٹ فارم پر دھند کے میں دو پرچھائیوں کی طرح کھڑے رہ گئے۔

ٹرین نے سپاری اور کیلے کے جھرمٹوں میں دوڑنا شروع کیا۔ گھُپ اندھیری رات جو مہا کالی، مادرِ فطرت، وقت کی راجدھانی ہے۔ ایک ریلوے کراسنگ کے نزدیک چھوٹے سے کالی مندر میں چراغ جل رہا تھا۔ تالاب

کے کنارے ایک درگاہ میں روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ تالاب پر کائی پھیلی تھی۔ اور کنول کھلے تھے۔

"ست، چیت اور آنند، جو مایا میں اس طرح پوشیدہ ہیں ـــــ جیسے تالاب پر کائی جم جاتی ہے۔"

میں نے کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکا کر آنکھیں بند کر لیں اور مجھے بہت سے، ہمیشہ یاد رہ جانے والے منظر یاد آئے۔

شاہ جلالؒ کی درگاہ کا حوض۔

ایک بوڑھی ہندو عورت جو حوض کی منڈیر پر جھکی سیاہ پانی میں تیرتی سُرخ متبرک مچھلیوں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

بانس کے ڈبوں میں چاء کے بیج کے کیڑے جمع کرتے ہوئے کچے بانس کے پلوں پر سے گزرتے، جھنڈیاں لگاتے ڈوری سے لٹکی تیل کی بوتلیں سنبھالے کسان ـــــ بید کے پودے ـــــ کیلاش اور بیل کے جنگل ـــــ بھٹیالی گاتے والوں کی آواز ـــــ ایک چھوٹا سا کالا بچہ، جسے اس کا باپ بڑی احتیاط، بڑے لاڈ سے ایک تالاب میں نہلا رہا تھا۔

راج شاہی کے دور اُفتادہ گاؤں کے چاء خانوں میں بیٹھے سنجیدگی سے اخبار پڑھتے ہوئے داڑھی والے کسان الاؤ کے گرد جاگ گان کی محفل ـــــ نورالعباد کی کوٹھڑی میں جلتا ہوا دیا۔

روشن لالٹین ہاتھ میں لٹکائے کوہاٹ کی سمت آتے ہوئے کسانوں کی ٹولیاں — نیلی عنابی، اودی، تہمدیں — نیلی عنابی اودی ساریاں بسفید دھوتیاں کم کم کے بڑے بڑے روشن ٹیکے، کاجل سے بھری آنکھیں، بھوک سے پچکے پیٹ — دوتارہ بجاتے باؤل اور اس کے بعد — واجد اور ربٹا فریزر عفور الرحمان میاں اور پاربتی۔

آدھی رات کے سناٹے میں انہت[1] کی آواز سنائی دیتی ہے۔

سری رام کرشن کے ایک عزیز چیلے، غالباً دویکا نند نے بیلوڑھ میں مہا کالی کے چرنوں میں پھول چڑھا کر دنیا تیاگتے ہوئے کہا تھا —

راج راجیشوری — بھونیلشوری — سدھیشوری، اپنی تقدیس اور اپنی ناپاکی — اپنا دھرم اور اپنا ادھرم، اپنی ودیا اور اودیا — اپنے پاپ اور اپنے پُن، اپنا خیر اور اپنا شر — اپنی نیکی اور اپنی بدی — سب لے لو اور مجھے خالص بھگتی دے دو۔

اور میری کزن زرینہ نے تھوڑی دیر ہوئی، سوال کیا تھا، ”خالص بھگتی میں بھی کیا مل جائے گا —؟“

ہلتی جلتی، چرخ چوں کرتی ٹرین اتھاہ رات کے سمندر میں سے گزرتی ڈھاکے کی طرف رواں رہی۔

دنیا میری سمجھ میں نہیں آئی۔

---

[1] نوائے سرمدی

ہماری مطبُوعات

ناقابلِ فراموش	دیوان سنگھ مفتون
کارِ جہاں دراز ہے	قرۃ العین حیدر
آشفتہ بیانی میری	رشید احمد صدیقی
رسیدی ٹکٹ	امرتا پریتم
پیغمبرانِ سخن	سردار جعفری
وہ صورتیں الٰہی	مالک رام
ساحر شخص و شاعر	ناز صدیقی
آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر
سیتا ہرن	"
ماں کی کھیتی	"
آدمی کا مقدر	"
ڈنگو	"
آلیس کے گیت	"
تلاش	"
کٹاری	سعادت حسن منٹو
ایک گدھے کی سرگزشت	کرشن چندر
الٹا درخت	"
دادر پل کے بچے	"
میری یادوں کے چنار	"
رات چور اور چاند	بلونت سنگھ
چک پیراں کا جسّا	"
ناگ منی	امرتا پریتم
یہ سچ ہے	"
پنجر	امرتا پریتم
انچاس دن	"
رنگ کا پتہ	"
ایک تھی انیتا	"
ڈاکٹر دیو	"
بلاوا	"
دو ہاتھ	عصمت چغتائی
بدن کی خوشبو	"
افسانے ڈرامے	"
ایک لڑکی ایک جام	امرتا پریتم
پھول کی تنہائی	کرشن چندر
محبت کی رات	"
سنئے غلام	"
بلونت سنگھ کے افسانے	بلونت سنگھ
ٹھنڈا گوشت	سعادت حسن منٹو
انارکلی	"
کالی شلوار	"
خالی بوتلیں خالی ڈبے	"
گنجے فرشتے	"
لاؤڈ سپیکر	"
نیچے اوپر اور درمیان	"
پت جھڑ کی آواز	قرۃ العین حیدر
فصلِ گل آئی یا اجل آئی	"

مکتبہ اُردو اَدب